سہ ماہی

تاریخ

۴۸

ایڈیٹر

ڈاکٹر مبارک علی

مجلس ادارت

ڈاکٹر سیّد جعفر احمد، ڈاکٹر روبینہ سہگل، جناب اشفاق سلیم مرزا،
پروفیسر ساجدہ وندل، پروفیسر پرویز وندل، ڈاکٹر انور شاہین،
ڈاکٹر غافر شہزاد، ڈاکٹر ریاض احمد شیخ

بیرون پاکستان: پروفیسر ہربنس مکھیا (ہندوستان)، ڈاکٹر گیانندر اپانڈے (امریکہ)،
پروفیسر امتیاز احمد (ہندوستان)، ڈاکٹر حسن نواز گردیزی (کینیڈا)،
ڈاکٹر خضر انصاری (برطانیہ)، ڈاکٹر سارا انصاری (برطانیہ)،
ڈاکٹر کامران اصدر علی (امریکہ)، ڈاکٹر طاہرہ خان (امریکہ)

تاریخ پبلیکیشنز، لاہور

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ

خط و کتابت (برائے مضامین)
بلاک ۱، اپارٹمنٹ ایف۔ برج کالونی، لاہور کینٹ
فون: ۰۴۲۔۳۶۶۶۵۹۹۷
ای۔میل: mubarakali21@yahoo.com

اہتمام	**تاریخ پبلیکیشنز**
	بُک سٹریٹ 39- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان
کمپوزنگ	فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز	سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق	نین تارا
تاریخ اشاعت	نومبر 2013ء
قیمت فی شمارہ غیر مجلد	-/320 روپے
قیمت فی شمارہ مجلد	-/400 روپے

تقسیم کار

فکشن ہاؤس: بُک سٹریٹ 39- مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-37249218-37237430

فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدر آباد، فون: 022-2780608

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی، فون: 021-32603056

فکشن ہاؤس

● لاہور ● حیدر آباد ● کراچی

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

مضامین

1-	میوؤں کی عہدِ وسطیٰ میں اسلامائزیشن اور کاشتکاری کے عمل میں ہجرت کی یادیں	سورج بھان بھردواج/سردار عظیم اللہ خاں میو	5
2-	بنگلہ دیش اور پاکستان کا بحران	حمزہ علوی/ڈاکٹر ریاض احمد شیخ	55
3-	سرمایہ داری کی ابتداء	ڈاکٹر مبارک علی	108
4-	صنعتی انقلاب اور ردِعمل	ڈاکٹر مبارک علی	113
5-	سائنٹیفک سوشل ازم اور کارل مارکس	ڈاکٹر مبارک علی	118
6-	آریا، انڈین قوم پرستی اور سندھ واپسی کی خواہش	رؤف نظامانی	125
7-	چین میں تہذیب کا ارتقا	اشفاق سلیم مرزا	131
8-	یورپی مرکزیت کا نقطہءنظر	ڈاکٹر مبارک علی	153
9-	تاریخ سے چشم پوشی	ڈاکٹر مبارک علی	157
10-	دانشور اور سماج	ڈاکٹر مبارک علی	161

تاریخ کے بنیادی ماخذ

165 شاہ عالم ثانی کے عہد کا دہلی دربار

مصنّفین: انتھنی پولیر، لوئی لوراں دولیسی

ترجمہ: نصیب اختر

میوؤں کی عہدِ وسطیٰ میں اسلامائزیشن اور کاشتکاری کے عمل میں ہجرت کی یادیں

سورج بھان بھردواج
ترجمہ: سردار عظیم اللہ خاں میو

تمہید

موجودہ دور میں عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں مختلف قومیتوں کے خودمختار اور علیحدہ تشخص پر تحقیق کی گئی ہے۔ اس تحقیق نے کامیابی سے یہ ثابت کیا ہے کہ گھسے پٹے نظریات کے برعکس یہ قومیتیں ایک لازمی جُز کے طور پر تبدیلی کے عمل سے گزری ہیں۔ ایک اور دلیل یہ دی جاتی ہے کہ یہ مرکز گریز قوتیں مرکزی طاقت سے اس لئے بھی مذاکرات سے گریزاں رہیں کہ اس طرح ان کی خودمختاری کے مختلف عناصر پر زد پڑتی تھی۔ میوات کے میوؤں کو بھی اسی تناظر میں ان کی پالوں کی سیاست کے ذریعے خودمختاری پر یقین رکھنے والوں کے طور پر پیش کیا گیا۔ اسی حوالے سے یہ موجودہ مضمون عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں قومیتوں کی خودمختاری کی بار بار دہرائی جانے والی کہاوت کو حقیقت کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش ہے۔ سلطنت کے دور میں میوؤں کو اراولی کی پہاڑیوں، وادیوں اور گھنے جنگلات، علاقہ میوات

میں رہنے والے ایسے قبائل کے طور پر پیش کیا گیا جن کا کام مویشی چُرانا، قتل و غارت اور لوٹ مار کرنا تھا۔ تاہم گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ایک اہم تبدیلی برپا ہوئی۔ نا صرف یہ کہ میووں نے کاشتکاری شروع کر دی بلکہ اپنی زمینداریاں بھی قائم کر لیں۔ میووں میں آہستہ آہستہ اسلامائزیشن کے عمل کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ مغل دور میں اسی تناظر میں ہمیں میو کئی دیگر اہم پیشوں سے بھی منسلک نظر آتے ہیں۔ وہ مغل سلطنت کے قابلِ اعتماد پیغام رساں کے طور پر جانے جاتے تھے جنہیں میوڑا کہا جاتا تھا۔ اسی طرح یہ شاہی خاندان کے ذاتی محافظ اور شاہی محل کے نگہبان جنہیں خدمتیہ پکارا جاتا تھا کے طور پر بھی نظر آتے ہیں۔ عام نظریئے کے برعکس میو اپنے اندرونی جھگڑوں کے تصفیے کے لئے بھی مغلوں کی ریاستی مشینری سے مدد لیتے دکھائی دیتے ہیں۔

راجستھان کے سرکاری ریکارڈ میں اس قسم کی بہت ساری عرضداشتیں، چٹھیاں، نمائندوں کی رپورٹس، اہلکاروں کے خطوط وغیرہ دیکھے جا سکتے ہیں جن سے میووں کے آپسی تنازعات اور میووں کے مغل سلطنت سے اختلافات کے شواہد ملتے ہیں۔

ان شواہد کی بنیاد پر اس مضمون میں قدیم نقطہ نظر کو چیلنج کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس مقصد کے لئے اس دور کے ترکی اور فارسی ادب اور قدیم سرکاری ریکارڈ کو بنیاد بنایا گیا ہے کیونکہ کسی بھی قوم کے بارے میں لکھنے سے پہلے ان کے موروثی رویوں کو دیکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس تحقیق میں ہم علاقہ میوات کے میووں کے تیرہویں سے اٹھارہویں صدی کے درمیانی حالات کا جائزہ لیں گے۔ موجودہ مضمون کا بنیادی نقطہء نظر میووں کی بطور کاشتکار تبدیلی شناخت کے عمل کو بذریعہ تاریخی شواہد و تجزیات، ان کی زبانی روایات کی روشنی میں دیکھنا ہے۔ اس مقصد کے لئے استعمال کئے گئے ریکارڈ میں اس وقت کی فارسی دستاویزات اور راجستھانی ذرائع خاص طور پر عرضداشتیں، چٹھیاں، نمائندوں کی رپورٹیں، اہلکاروں کے خطوط، دستورالعمل اور یادداشتیں شامل ہیں۔

میوؤں کی کاشتکاری اور اسلامی تشخص کی طرف منتقلی کے عمل کو سمجھنے میں جگاؤں کی دستاویزات بھی بہت اہم ہیں۔ میوؤں کی لوک روایات جن میں روایتی گیت، اور عظیم لوگوں کی کہانیاں جنہیں کئی علماء جیسے نرسنگھ میو، اے کنگھم اور جیمز ٹاڈ وغیرہ نے محفوظ کیا ہے بھی اہم ہیں۔ اس مضمون میں تیرہویں سے اٹھارہویں صدی تک میوؤں کی سماجی، معاشی اور تہذیبی تاریخ کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس مضمون میں ایک مختصر تاریخی تجزیہ اس حوالے سے پیش کیا گیا ہے اگرچہ مورّخین نے میوؤں کے تذکروں کو بہت زیادہ اہمیت نہ دی ہے مگر اب کچھ ماہرینِ عمرانیات و سماجی علوم نے اس طرف توجہ دی ہے۔

اس سے قبل کچھ انگریز ماہرین نے بھی میوؤں کے حوالے سے دلچسپ معلومات اکٹھا کی تھیں۔ میوؤں کا ابتدائی تذکرہ سلطنت دور کی فارسی دستاویزات میں ملتا ہے۔ منہاج سراج اور ضیاءالدین برنی دونوں میوؤں کو قانون شکن، لٹیرے، راہزن اور مار دھاڑ کرنے والے حملہ آوروں کے طور پر پیش کرتے ہیں جو سلطنتِ دہلی کے لئے شدید خطرہ تھے۔ یحییٰ بن احمد سرہندی میوات خاص طور پر میواتی سرداروں اور تغلق اور سیّد حکمرانوں کے بارے میں زیادہ تفصیلی معلومات فراہم کرتا ہے۔

بابر نامہ میں علاقہ میوات کی زیادہ واضح منظر کشی کی گئی ہے۔ اس میں میوات کی جغرافیائی اور سماجی حالت کا تذکرہ ہے۔ تاہم بابر نامہ اس لحاظ سے زیادہ اہم ہے کہ اس میں حسن خاں میواتی کے بطور ایک طاقتور حکمران اس وقت کے ہندوستان میں سیاسی اور فوجی کردار کا ذکر ہے۔ بابر نے الزام عائد کیا ہے کہ اس کے خلاف جنگِ خانوا کا سب سے بڑا محرک حسن خاں ہی تھا۔ آئینِ اکبری اکبر کے عہدِ حکومت میں علاقہ میوات اور میوؤں کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کرتی ہے۔ میوؤں کا تذکرہ نہ صرف کاشتکاروں بلکہ ایسے زمینداروں کے طور پر کیا گیا ہے جنہوں نے علاقے کے کئی پرگنوں میں اپنی زمینداریاں

قائم کر لی تھیں۔

آئینِ اکبری سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ میوؤں کا ایک گروپ جو کہ میوڑا اور خدمتیا کہلاتا تھا، کو اکبر نے مغل ریاست کے محکمہ ڈاک میں ملازم رکھا ہوا تھا۔

ارژنگِ تجارہ ایک مقامی رسالہ ہے جس میں میوات کے خانزادوں کی سلطنت دہلی سے مغل دور تک کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے۔اس کے ذریعے میوؤں کی زندگی کے کئی سماجی وتہذیبی پہلوؤں تک ہماری رسائی ہوتی ہے۔میوؤں کے راجپوت نسل سے تعلق پر مصنف نے شک کا اظہار کیا ہے۔انگریز ماہرین نسلیات جیسے اے کننگھم اور پاؤلیٹ نے میوؤں کو ایک وحشی سماجی گروپ مینا سے نکلا بتایا ہے۔نہ صرف نسلی طور پر بلکہ جرائم سے تعلق کے لحاظ سے بھی۔ان ماہرین کی یہ تحریریں سماجی، معاشی، سیاسی اور تہذیبی سطح پر میو شناخت تک رسائی میں کافی مددگار ہیں۔

موجودہ دور میں عرفان حبیب نے میوؤں کو ان کے مغل دور میں بطور ہرکارہ ''میوڑا'' کردار کے حوالے سے دوبارہ موضوع تحریر بنایا ہے۔وہ دلیل دیتے ہیں کہ مغل سلطنت میں ڈاک کا مرکزی نظام اپنی علاقائی وسعت کے لحاظ سے کافی لمبا چوڑا تھا کیونکہ احکامات کو سلطنت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچانا ہوتا تھا۔شیل مایا رام کی تحریروں نے میوؤں کی تاریخ اور روایات میں زبردست دلچسپی کو جنم دیا ہے۔ان کے پچھلے کام میں میوؤں کے الور و بھرتپور ریاستوں سے تعلقات کا ایک واضح تذکرہ ملتا ہے۔ان کی بعد کی تحقیق ان روایتوں اور کہانیوں کا احاطہ کرتی ہے کہ کس طرح میو پالوں میں تقسیم ہونے کی وجہ سے ایک ریاست قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

میوؤں میں یہ روایت مقبول عام ہے کہ ان میں زمینیں اکبر اعظم نے تقسیم کی تھیں۔ تاریخی حقائق سے اس بات کی تصدیق اس طرح ہوتی ہے کہ آئینِ اکبری میں ابوالفضل نے لکھا ہے کہ اکبر اعظم کے دور میں میوات براہ راست مغل ریاست کے زیر انتظام آ گیا۔

تمام علاقہ ءمیوات چار سرکاروں اور دو مغل صوبوں آگرہ و دہلی میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہ سرکاریں مزید 67 پرگنہ جات میں تقسیم تھیں اور میوؤں نے سرکار الور، تجارہ اور سحر کے پرگنہ جات تعدادی 13، 14 اور 4 میں بالترتیب اپنی زمینداریاں قائم کی ہوئی تھیں۔ علاقہ میں میو زمینداریوں کی اہمیت اور اکبر اعظم کے دور میں مغل ریاست کی طرف سے انہیں تسلیم کرنے کے عمل سے اس روایت نے جنم لیا کہ ہر پال (بڑا قبیلہ یک جدی گروپ) کو زمین اکبر نے الاٹ کی تھی۔ سولہویں صدی کے اختتام تک نہ صرف میو مالکانہ حقوق والے کاشتکاروں میں تبدیل ہو گئے بلکہ اُنہوں نے علاقہ ءمیوات پر اپنے زمینداری حقوق بھی مضبوط کر لئے۔ زراعت سے وابستہ دوسری اقوام جیسے جاٹ، گوجر، اہیر، راجپوت، برہمن اور مالی وغیرہ بھی میوات کے باشندوں میں شامل تھے۔

علاقہ ءمیوات دہلی سے جنوب مغرب کی طرف تقریباً 64 کلومیٹر دور سے شروع ہوتا ہے اور جدید اضلاع الور و بھرتپور صوبہ راجستھان اور ضلع نوح صوبہ ہریانہ پر مشتمل ہے۔ یہ موجودہ دور کی 9 تحصیلوں تجارہ، کشن گڑھ، الور اور لچھمن گڑھ (ضلع الور) ڈیگ نگر اور کاماں (ضلع بھرتپور) اور نوح اور فیروز پور جھرکا (ضلع نوح) پر مشتمل ہے۔ علاقے کا مشہورِ عام نام میوات یعنی میوؤں یا میؤوں کا علاقہ ہے۔ میوؤں کا یقین ہے کہ لفظ ''میؤات'' ''میؤ'' سے نکلا ہے اور لفظ میو یا میؤ ''میواس'' سے نکلا ہے جس کے معانی ''لٹیروں کے چھپنے کی جگہ'' ہیں۔ اس طرح سرکاری وقائع اور تذکروں میں لفظ ''میؤ'' لٹیرے، فسادی اور قانون شکن کا مترادف بن گیا۔ میوات کا جغرافیہ اراولی کے پہاڑی سلسلے، میدانوں اور گھنے جنگلات کی وجہ سے کافی شاندار اور متنوع ہے۔ اراولی کی پہاڑیاں جنگلی جانوروں جیسے شیر (ناہر)، چیتا، بھیڑیا، لکڑ بھگا، لومڑی، گیدڑ اور ہرن کی پناہ گاہیں ہیں۔ فیروز شاہ تغلق کو جنگلی درندوں سے بہت دلچسپی تھی لہٰذا اُس نے جھیل کوٹلہ کے نزدیک کالا پہاڑ کی تنگ چوکی پر شکار کے ٹھکانے کے طور پر ایک چھوٹا قلعہ تعمیر کروایا تھا۔ کالا پہاڑ کی

یہ تنگ چوٹی میوات کے مرکز میں ہے اور صوبہ ہریانہ کو راجستھان سے علیحدہ کرتی ہے۔ کہیں کہیں یہ تنگ پہاڑ 300 میٹر تک اونچا ہو جاتا ہے اور اپنی مسلسل لمبائی کی وجہ سے مشہور ہے۔ اوایچ کے سپیٹ کے الفاظ میں تمام پہاڑیوں میں عام طور پر خشک مگر کبھی کبھار بہت زور شور سے بہنے والے تیز رو برساتی نالوں نے کٹ لگائے ہوئے ہیں جن میں گہرے مثلث بنے ہوئے ہیں۔ کالا پہاڑ سے ملحقہ زمین کا کافی بڑا حصہ انہی پانی کے بہاؤ سے بننے والے نالوں کے کٹاؤ کی وجہ سے کاشتکاری کے قابل نہیں رہا۔ عہدِ وسطیٰ میں علاقہ میوات میں جھیلیں، موسمی ندیاں، چشمے اور قدرتی ڈیم کثرت سے تھے جو زرعی پیداوار کے لئے علاقہ کو سیراب کرنے کا اہم ذریعہ تھے۔ مرکزی جھیلیں کوٹلہ، چندینی، سلی سیڑھ اور دیوتی تھیں۔ جب ان جھیلوں میں پانی وافر ہوتا تھا تو یہ پانی نالوں کے ذریعے خوردنی اور نقدآور فصلوں کی کاشت کے لئے فراہم کیا جاتا تھا۔ بعدازاں جب یہ جھیلیں خشک ہو گئیں تو ان کے زرخیز علاقے میں اہم فصلیں جیسے گندم، گنا اور کپاس کی کاشت ہونے لگی۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ میو کسان نہ صرف خوردنی اجناس بلکہ نیل، کپاس، گنا، ہلدی اور لوبیا بھی اُگاتے تھے۔ کالا پہاڑ اور اراولی کی دیگر پہاڑیاں سلطنت کے دور سے بھی پہلے سے ہی خطرناک جنگلی حیات کے لئے خوراک، پانی، پناہ اور حفاظت مہیا کرتی رہی تھیں۔ کالا پہاڑ کے بارے میں یہ مقبول عام کہاوت علاقہ میوات کی جغرافیائی صورتحال کی وضاحت کرتی ہے۔ ؎

اِت دلّی اُت آگرو ات متھرا اور بیراٹھ
میرو کالو پہاڑ سہاونوں جا کے بیچ بسے میوات

ترجمہ: میوات کا جغرافیہ اس طرح ہے کہ اس کے ایک طرف دلّی اور دوسری طرف متھرا، آگرہ اور بیراٹ ہے۔ کالا پہاڑ سارے میوات میں پھیلا ہوا ہے جس کی خوبصورت پہاڑیاں اور دلکش وادیاں

میوات کے حسن میں چار چاند لگاتی ہیں۔

یہ کہاوت اس لئے بھی اہم ہے کہ کالا پہاڑ کے دونوں طرف گنجان آباد گاؤں اور زراعت کے لئے موزوں زرخیز زمین کے قطعات ہیں۔ایک قدیم خیال جو کہ بہت مقبول ہے یہ بھی ہے کہ کالا پہاڑ میوات کے لئے اللہ کی رحمت ہے جو نہ جانے کب سے یہاں کے باشندوں اور جانوروں کو خوراک، پناہ، پانی اور دیگر فوائد مہیا کر رہا ہے۔میوؤں کی آبادکاری اور ذریعہء معاش کے بارے میں فارسی ذرائع اور زبانی روایات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کاشتکاری اختیار کرنے سے پہلے میوؤں کے مختلف قبائل مویشی چوری، راہزنی اور لوٹ مار کے پیشے سے وابستہ تھے اور یہ قبائل کالا پہاڑ اور میوات میں اراولی کی دیگر پہاڑیوں میں آباد تھے۔منہاج سراج جُز جانی لکھتا ہے۔

''بلبن (الغ خان) اور دوسرے سرداروں نے اپنی افواج اور شاہی دستوں کے ساتھ اچانک پہاڑوں میں اپنی مہم شروع کی اور بروز پیر 4 صفر 658ھ (20 جنوری 1260ء) کو لشکر اپنی پہلی مہم پر روانہ ہوا۔ وہ پہاڑوں، تنگ وادیوں اور گہری کھائیوں میں پسپا ہو گئے لیکن اُن سب کو گھیر کر ختم کر دیا گیا۔بیس دن تک شاہی لشکر نے تمام اطراف میں پہاڑوں کو چھان مارا۔ پہاڑی لوگوں کے گاؤں اور رہائش گاہیں بلند چوٹیوں اور چٹانوں پر نہایت مضبوط تھیں لیکن اُن سب کو الغ خان کے حکم سے تباہ کر دیا گیا اور وہاں کے رہائشی جو چور، ڈاکو اور راہزن تھے تمام کے تمام قتل کر دیئے گئے۔

عبدالعزیز نے بارہ ایسے دیہات کا پتہ چلایا ہے جن کے بارے میں میوؤں کا کہنا ہے کہ وہ ان کی پال وار بنیادی آبادیاں تھیں۔قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ میو پالوں کے یہ بارہ گاؤں اب تباہ و برباد حالت میں ہیں۔لیکن پرانی اور نئی آبادی کے درمیان جواب تمام کی تمام میدانوں میں آباد ہے ایک خاص اور امتیازی تعلق یہ ہے کہ یہاں بھی میو بارہ علاقائی پالوں کے تحت ہی آباد ہیں۔ابتدائی رہائشی علاقوں پہاڑیوں پر موجود کھنڈرات اور میدانی

علاقوں میں ان کی بعدازاں آبادکاری میوآبادی کی پہاڑوں سے میدانوں کی طرف بہت بڑی ہجرت کی نشاندہی کرتی ہے۔اس بات کی تصدیق جگاؤں کی دستاویزات اور میوزبانی روایت سے بھی ہوتی ہے۔

جگاؤں کا ریکارڈ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ دیڑوال میو کے آباؤاجداد کالا پہاڑ میں رہتے تھے۔انہیں ناتھ یعنی سانپ سدھانے والا کہا جاتا تھا اسی لئے تمام دیڑ وال میوؤں کو ناتھ کہا جاتا ہے کیونکہ ان کا شجرہ ایک ہی جگہ ملتا ہے۔دیڑ وال میوؤں کے آبائی گاؤں نوح کے قریب میولی میں تھے جنہیں میواسنگھ نے بسایا تھا۔جگاؤں کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ وہ کالا پہاڑ میں آبادباون کھوئری (آبادیاں) کا سربراہ تھا۔

لفظ دیڑ وال ''ڈہر'' سے نکلا ہے علاقہ نوح میں کوٹلہ جھیل کے قریب نشیبی علاقہ ڈہر کہلاتا ہے۔ایک دوسری روایت میوکی لنڈاوت پال کے حالات کے بارے میں ہے کہ کس طرح اُنہوں نے کالا پہاڑ ضلع الور کی رام گڑھ تحصیل کے میدانی علاقے کی طرف نقل مکانی کی۔انہیں کاشتکاری کے عمل میں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ تمام علاقہ کانٹے دار جھاڑیوں اور گھنے جنگلات سے گھرا ہوا تھا۔انہیں باگھوڑیا میو بھی کہا جاتا ہے کیونکہ باگھوڑہ اس پال کا بنیادی گاؤں ہے۔ایک میوگروپ کا تعلق شاہ آباد (تجارہ سرکار) اور ساپن (سانپ سدھانے والے) بھی ہے اور ان کا گوت ناتھ پال کے لوگوں سے ملتا ہے۔اسی طرح جگاریکارڈ سے چھرکلوت، پونگلوت، ڈیمروت، دولوت اور نیائی میو پالوں کی اراولی کے پہاڑی سلسلے میں ابتدائی آبادیوں کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔

مویشی چوری، راہزنی اور ڈاکے کے علاوہ ان پالوں کا سب سے اہم ذریعہ معاش مویشی پالنا تھا۔لوک روایات اور بیانیے بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ ان پانچ پالوں کا مورث ایک تھا اور ان میں آپس میں بھائی چارہ تھا یہی وجہ ہے کہ یہ پالیں آج بھی آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتیں۔جیسا پہلے لکھا جاچکا ہے یہ کالا پہاڑ میں رہتے تھے اور مسافروں

اور تاجروں کو لوٹنے کے پیشے سے منسلک تھے۔ اس حوالے سے ایک مقبول عام کہانی یہ بھی ہے کہ جب ان لوگوں کے خلاف شکایات حد سے بڑھ گئیں تو ایک مقامی حکمران نے پانچوں شرارتی پالوں کے سرداروں کو گرفتار کرنے کے لئے فوج بھیجی۔ تاہم تمام پانچوں سردار مداری، سپیرا، ڈھولچی، ٹوکری بنانے والا اور گھسیارے کا بہروپ دھار کر فوج کے شکنجے سے نکل گئے اور بعد ازاں میدانی علاقے میں رہائش اختیار کر کے کاشتکاری شروع کر دی۔ جو سردار مداری کے بھیس میں روپوش ہوا تھا الور کے علاقہ کچھمن گڑھ میں آباد ہو گیا۔ اُس نے موضع کجھوتہ آباد کیا جو بعد میں ڈیمروت پال کا بنیادی گاؤں کہلایا۔ سپیرے کا روپ دھارنے والے نے الور کے علاقہ میں کھیتی باڑی شروع کر دی جہاں اُس نے موضع نیملی آباد کیا۔ وہ پونگلوت پال بانی تھا۔ تیسرا فیروز پور جھرکا کے نزدیک آباد ہو گیا اور چھرکلوت پال کا بانی بنا۔ جگا ریکارڈ کے مطابق چھرکن نامی شخص چھرکلوت پال کا بانی تھا۔ چوتھا میو سردار الور کے علاقہ رام گڑھ میں آباد ہو گیا اور نیائی پال کا مورثِ اعلیٰ بنا۔ پانچویں اور آخری نے بھی نگر ضلع بھرتپور اور فیروز پور جھرکا کے درمیانی علاقے میں کاشتکاری شروع کی اور دولوت پال کا بانی قرار دیا گیا۔ میوؤں کی بطور ڈاکو اور راہزن شناخت عہدِ وسطیٰ کے شاعر لاسندھی کے مندرجہ ذیل دوہے سے بھی ہوتی ہے۔

ترجمہ: برج کے علاقہ کے جنگلات کی مسحور کن خوبصورتی میں عاشق
بلا روک ٹوک درختوں کے گرد گھوما کرتے تھے مگر جب سے فسادی
اور لوٹ مار کرنے والے میو اس علاقے میں آئے ہیں محبت کرنے
والے یہ علاقہ ہی چھوڑ گئے ہیں۔

عام روایات اور فارسی وقائع بیان کرتے ہیں میوؤں کا پیشہ راہزنی، ماردھاڑ اور ڈکیتی تھا جن کی وجہ سے علاقہ میں سفر کرنا اور تجارت ممکن نہ رہا تھا یہ لوگ دلّی اور آس پاس کی آبادی کے لئے بہت بڑا مسئلہ بنے ہوئے تھے۔ میو جو مختلف قبائل میں بٹے ہوئے تھے

اراولی کی پہاڑیوں، تنگ وادیوں اور جنگلات میں رہتے تھے۔ ان کے طرزِ حیات اور پیشہ ورانہ شناخت کی وجہ سے بیرون میوات کے لوگ اُنہیں ''میو'' کے نام سے پکارنے لگے۔ اس طرح اراولی کی پہاڑیاں ان مختلف قبائل کا گھر بن گئی تھیں جنہیں اپنی روزی روٹی کے لئے بہت جدوجہد کرنا پڑتی تھی۔ اصل میں ان کی جغرافیائی وسماجی علیحدگی نے انہیں ایسی زندگی کی طرف مائل کیا تھا جس میں وہ سماجی اور سیاسی طور پر آزاد تھے۔ دلّی اور آگرہ کے علاقے میں ہونے کی وجہ سے میوات شاہان دہلی کی پہنچ میں تھا۔ منہاج سراج اور برنی کی تحریروں سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ میو دہلی سلطنت کے لئے دردسر تھے۔ اُنہیں میوؤں کی قانون شکن اور مار دھاڑ والی سرگرمیوں کو قابو میں رکھنے کے لئے فوج کشی کرنا پڑتی تھی۔ لوک بیانیوں اور ہند فارسی وقائع کا باریک بینی سے تقابل یکساں نتائج ظاہر کرتا ہے۔ طبقاتِ ناصری میں منہاج سراج ذکر کرتا ہے کہ میواتی لٹیرے اور ڈاکو تھے جو مسلمان تاجروں اور باشندوں سے ان کا مال و متاع چھین لیا کرتے تھے۔ وہ اپنی لوٹ مار کی سرگرمیاں ہریانہ کے موضعات، شوالک کی پہاڑیوں اور بیانہ کے علاقے میں کرتے اور مویشیوں کو آپس میں تقسیم کر لیتے۔ منہاج مزید لکھتا ہے۔

''الغ خان نے سر کی قیمت ایک چاندی کا ٹنکہ اور زندہ میو لانے والے کو دو ٹنکے دینے کا حکم دیا۔ ان انعامات کے لالچ میں سپاہی اونچی پہاڑیوں پر چڑھ گئے اور تنگ وادیوں اور گہری کھائیوں میں گھس کر مُردوں کے سر اور قیدی لاتے تھے۔ باغی ہندو جنہوں نے اونٹ لوٹے تھے خاندانوں سمیت پکڑ لئے گئے۔''

امیر خسرو نے لکھا ہے کہ جب سلطان علاؤالدین خلجی نے رنتھمبور کے خلاف اپنی فوجی مہم شروع کی تو وہ میوات کے علاقہ سے گزرا۔ تاہم یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ امیر خسرو نے میوؤں کی کسی خلاف قانون اور شر پسندانہ حرکت کا ذکر نہیں کیا۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ میوات اراولی کی اونچی پہاڑیوں میں گھرا جنگلی حیات سے بھرا ہوا علاقہ تھا۔

ایک سال بعد ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں بلبن کے دور میں میوؤں کی طرف سے پیدا کردہ مسائل کے بارے میں لکھا ہے۔

''دہلی کے نواح میں میواتیوں کی سرگرمیاں اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ شہر کے مغربی دروازے نماز عصر کے وقت ہی بند کر دیئے جاتے تھے اور کسی شخص کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ عصر کے بعد شہر سے باہر اُس سمت جائے، چاہے وہ مزارات پر زیارت کے جانے والے ہوتے یا شاہی ملازمین۔ عصر کے وقت سے ہی میواتی آ جاتے اور پانی بھرنے کے لئے جانے والی لڑکیوں کو تنگ کرتے اُن کے کپڑے چھین کر لے جاتے۔ میواتیوں کی ان بے خوف سرگرمیوں نے شہر میں خوف و ہراس پھیلا دیا تھا۔

خلجی دور میں میوؤں کی قانون شکن سرگرمیوں کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ تاہم یہ بات ہمارے مشاہدے میں آتی ہے کہ میوا اپنی پرانی عادتوں کی طرف لوٹ رہے تھے، اور یہ امر تغلق دور کی تحریروں سے عیاں ہے۔ فیروز شاہ تغلق نے میوؤں کی سرگرمیوں کو کنٹرول کرنے کے لئے فیروز پور جھرکا میں ایک مستقل فوج تعینات کر دی تھی، اور اندور کے مقام پر اراولی کی پہاڑیوں میں (کالا پہاڑ) ایک قلعہ بھی تعمیر کروایا جو فوجی مقاصد اور شکار کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ فیروز شاہ تغلق کے دور میں میوا اور جادو راجپوتوں کا ایک گروپ سرگرمی سے مار دھاڑ اور راہزنی کی وارداتوں میں ملوث تھا۔

ارژنگِ تجارہ کا مصنف لکھتا ہے کہ جادو راجپوتوں کی ایک شاخ اور میو لوٹ مار قانون شکنی اور آتش زنی کی وارداتوں کے لئے تمام علاقے میں بدنام تھے۔ اُنہوں نے سلاطینِ دہلی کے لئے امن و امان کا مسئلہ پیدا کر دیا تھا مجبوراً فیروز شاہ تغلق کو ان کے خلاف فوج کشی کرنا پڑی۔ اُس نے میوات کی طرف خصوصی توجہ دی اور دو نئے قصبات تغلق پور اور سلطان پور آباد کئے۔

جگوں کا ریکارڈ ظاہر کرتا ہے کہ میو کھیتی باڑی کی طرف چودھویں صدی کے اخیر سے

ابتدائی سولہویں صدی کے درمیان آئے جب علاقے پر خانزادوں کی حکومت تھی۔اس دور میں نوح فیروز پور جھرکا اور تجارہ کے درمیان کئی نئے گاؤں آباد کئے گئے۔ نئے گاؤں کالا پہاڑ کے علاقے میں بسائے گئے تھے جغرافیائی طور پر میو دیہات کو تین درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ا۔ وہ علاقہ جو کالا پہاڑ سے ملحقہ ہے اس میں نوح فیروز پور جھرکا، تاوڑو، پُناھنا، تجارہ اور رام گڑھ کے علاقے شامل ہیں۔

ب۔ کشن گڑھ، پچھمن گڑھ اور راج گڑھ کے علاقے۔

پ۔ الور، کاماں، ڈیگ اور پہاڑی۔

میوؤں کا سماجی جائزہ ظاہر کرتا ہے کہ میوات میں پہاڑوں سے میدانوں کی طرف نقل مکانی کا یہ سلسلہ عہد وسطیٰ کے اخیر تک چلتا رہا۔مثال کے طور پر ڈیمروت پال کے 160 گاؤں ہیں جو تین بڑے گروپوں میں تقسیم ہیں۔ان میں سب سے بڑا گروپ الور کی تحصیل پچھمن گڑھ میں ہے۔دوسرا گروپ جس میں چالیس گاؤں آتے ہیں فیروز پور جھرکا اور کاماں (ضلع بھرتپور) کے درمیان آباد ہے۔تیسرا گروپ جس میں بارہ گاؤں آتے ہیں فیروز پور جھرکا تھیل پناھنا کے قریب آباد ہے۔اسی طرح تینوں گروپوں کے اپنے علیحدہ چودھری ہیں۔

تبدیلی کا یہی عمل میو کی نیائی پال میں نظر آتا ہے۔رام گڑھ اور الور کے درمیان آباد ہونے والی نیائی پال بھی دو حصوں میں منقسم ہے۔بڑا گروپ جس میں پچاس گاؤں شامل ہیں رام گڑھ شہر کے مغرب کی طرف آباد ہے۔دوسرا گروپ جس میں دس گاؤں ہیں کاماں ضلع بھرتپور کے قریب آباد ہے۔تاہم دونوں گروپوں کا درمیانی فاصلہ پچاس کلومیٹر ہے۔ اگرچہ دونوں گروپ ایک ہی پال سے ہیں مگر دونوں کے علیحدہ چودھری ہیں۔

یہ رجحان ظاہر کرتا ہے کہ میو پالوں کی آبادی میں اضافے کے بعد قابلِ زراعت زمین

ان کی ضروریات کے لئے ناکافی رہی ہوگی لہٰذا پال کے کچھ خاندان نقل مکانی کر کے میوات کے اندر ہی ایسی مناسب جگہ چلے گئے ہوں گے جہاں کاشتکاری کے لئے سازگار ماحول دستیاب ہو۔ میوؤں کی لوٹ مار اور رہزنی کی وارداتوں کا منہاج سراجؔ اور برنیؔ نے ابتدائی ہند فارس تحریروں میں جیسے تذکرہ کیا ہے ویسا تذکرہ سلطنت دور کے اخیر کی تحریروں میں نظر نہیں آتا۔ پندرہویں صدی سے بعد کی میوؤں سے متعلق ہند فارس تحریریں ان کے مالیہ اور خراج نہ ادا کرنے سے متعلق ہیں۔ مغل دور میں میوؤں اور مغلوں کے درمیان اس قسم کے تنازعات مزید بڑھ گئے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کب اور کیسے میوؤں نے اپنے آپ کو کاشتکار طبقے میں تبدیل کیا۔ وہ کیا حالات تھے جنہوں نے اُنہیں اراولی کی پہاڑیوں سے میدانوں کی طرف نقل مکانی پر مجبور کیا اور کس چیز نے انہیں قبائل سے کسان بننے کی طرف راغب کیا۔ شاید میوؤں نے سلاطین دہلی کے لئے امن وامان کا شدید مسئلہ پیدا کر دیا ہو اور میوات سے تجارتی وکاروباری قافلوں کا گزر مشکل ہو گیا ہو۔ تغلق عہد کے بعد میوؤں کے کاشتکاری کی طرف منتقلی کے عمل کی کئی وجوہات ہیں۔ مثال کے طور پر سلاطین کی بے رحمانہ فوجی مہمات نے بھی میوؤں کو اپنی قانون شکن عادات چھوڑنے کے لئے مجبور کیا ہو گا۔ ثانیاً میوؤں کی بڑھتی آبادی نے اراولی کی پہاڑیوں پر زندگی کے ذرائع کو ناکافی بنا دیا ہوگا۔ بلبن کی طرف سے بہت بڑے پیمانے پر جنگلات کی کٹائی بھی اس کی ایک وجہ ہوسکتی ہے۔ برنیؔ لکھتا ہے کہ دہلی کے تخت پر بیٹھنے کے فوراً بعد بلبنؔ نے میواتی شورش کو دبانے کی کوشش شروع کر دی اور جنگل کی کٹائی اور میواتیوں کو وہاں سے نکالنے میں مصروف ہو گیا۔ قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ بلبنؔ نے گوپال گیر کا قلعہ بنوایا اور شہر کی حدود میں کئی چوکیاں بنوا کر افغانوں کو مقرر کیا اور ان کی گزر اوقات کے لئے زمینیں الاٹ کیں۔ دوسرا اہم کام بڑے پیمانے پر جنگلات کی صفائی، قلعوں کی تعمیر، ان پر افغانوں کی تعیناتی، زمینیں الاٹ کرنے کے نظام کا نفاذ اور نئے گاؤں اور قصبات کی آبادکاری علاقہ ءمیوات میں کاشتکاری کے

لئے سازگار ماحول پیدا کرنے کی کوششوں کا حصہ تھے۔ جنگلات کے علاقے کی زرعی زمین میں تبدیلی علاقے میں کاشتکاری کے رجحان کو بڑھانے کی طرف پہلا بڑا قدم تھا۔ تاہم مندرجہ بالا حقائق سے بھی اہم خانزادوں کی ریاست کا قیام تھا۔ جنہوں نے (1527ء- 1390ء) میوات میں تجارہ کے علاقے کوٹلہ میں اپنے لئے ایک چھوٹی ریاست تشکیل دے دی تھی اور جس نے میوؤں کو کاشتکاری کی طرف لگا دیا۔ خانزادوں نے میوؤں پر کافی دباؤ دیا کہ وہ اپنے پرانے پیشے کو چھوڑ کر کاشتکاری اختیار کریں تا کہ ریاست کی معاشی بنیاد کو مضبوط بنایا جا سکے۔ اس طرح معاشی حالت میں سدھار کے لئے خانزادوں کے دورِحکومت میں میو کاشتکاری کرنے لگے۔ لگتا ہے کہ اُنہوں نے اراولی کی پہاڑیوں میں رہنے والے قبائلیوں کو دبایا ہوگا۔ یہ روایت ایک لوک کہانی سے نکلی ہے جو جادوبنس کی پانچ پالوں چھرکلوت، دولوت، پوندلوت، ڈیمروت اور نیائی کے بارے میں ہے جنہوں نے میدانی علاقے میں رہائش اختیار کر کے ابتدائی پندرہویں صدی میں کاشتکاری شروع کردی۔

جگاؤں کا ریکارڈ بھی ظاہر کرتا ہے کہ پندرہویں صدی کی ابتداء میں نوح فیروز پور جھرکا، رام گڑھ (کھلوہرا) اور پچھمن گڑھ کے پرگنہ جات میں میو گاؤں آباد کئے گئے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ علاقہ جہاں ان پانچ پالوں کے گاؤں آباد کئے گئے ابتدائی دنوں میں خانزادہ ریاست کا مرکز تھا۔ ریاست کے زبردست دباؤ کے تحت اپنے سابقہ پیشے کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے میوؤں کے پاس کاشتکاری کے علاوہ کوئی متبادل پیشہ نہ تھا۔ سولہویں صدی کی ابتداء میں کچھوتا کے نرسنگھ میو کی طرف سے لکھے گئے تاریخی گیت ''حسن خان کی کتھا'' جس میں پانی پت کی پہلی جنگ اور جنگِ خانوا کا ذکر ہے میں مذکور ہے کہ میوؤں کی بارہ پالیں بطور سپاہی حسن خان کی فوج میں شامل تھیں جو بابر کے خلاف جنگِ خانوا میں شامل تھیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور تک آتے آتے میوؤں نے کاشتکاری کے

ساتھ سپہ گری کو بھی اختیار کر لیا تھا۔

ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں لکھا ہے کہ اکبر کے دور میں میوؤں کے زمینداری حقوق میوات کے کئی پرگنوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ سرکار تجارہ میں اٹھارہ میں سے چودہ پرگنوں پر میوؤں کا بلاشرکتِ غیرے اختیار تھا بقیہ چار میں ان کے ساتھ دیگر ذاتیں جیسے خانزادے اور ٹھاٹھر بھی شامل تھے۔ الور سرکار میں میو تینتالیس پرگنوں میں سے پانچ کے بلاشرکتِ غیرے مالک تھے۔ بقیہ میں سے سات پرگنوں میں ان کے ساتھ دیگر ذاتیں مثلاً گوجر، جاٹ اور خانزادے بھی شامل تھے۔ آئینِ اکبری میں کوئی صراحت نہیں ہے کہ سرکار الور کے بقیہ اکتیس پرگنوں میں بھی کوئی میو زمینداری تھی یا نہیں۔ سرکار ساحر میں کوئی بھی پرگنہ مکمل میو زمینداری کے ماتحت نہیں تھا۔ وہ کل سات میں سے چار پرگنوں میں دیگر ذاتوں مثلاً جاٹ، ٹھاٹھر اور گوجروں کے ساتھ اپنے زمینداری حقوق استعمال کرتے تھے۔ بقیہ تین میں ان کا زمیندارانہ حقوق کا کوئی دعویٰ نہ تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاہٹ میوؤں کا زراعت کی طرف رجحان اکبر کے دور تک انتہائی سُست تھا۔ ریواڑی سرکار کے دو پرگنے سوھنا اور تاؤڑو میوات کا حصہ تھے لیکن ان دونوں پرگنوں میں میوؤں کے پاس اکبر کے دور تک ایک بھی زمینداری نہیں تھی۔ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان پرگنوں کے میو ابھی زراعت سے دور دور تھے جس کی وجہ سے وہ ابھی زمینداری کے درجہ تک نہ پہنچے تھے۔ میوات کے علاقہ میں میو زمینداریوں کے اعداد و شمار سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ مغل ریاست میں اکبر کے دور تک علاقہ میوات کی یکجہتی نے میوؤں کے کاشتکاری کی طرف تبدیلی کے عمل میں اہم کردار ادا کیا۔ اکبر کے بعد کی صدیوں میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور انیسویں صدی کے آخر تک میو علاقے کی بہت بڑی زمیندار آبادی بن گئے۔ 1872ء کی مردم شماری کے مطابق ریاست الور کے کل 180,225 زمیندار گھرانوں میں سے میو گھرانے 94546 تھے اور ان کی تعداد کل آبادی کے نصف سے زیادہ تھی جبکہ اکبر کے دور

میں الور سرکار کے تینتالیس پرگنوں میں سے اکتیس میں کوئی میوزمینداری نہ تھی۔اس طرح یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اکبر کی موت سے انیسویں صدی کے وسط تک الور سرکار میں میوؤں نے کاشتکاری کو بہت بڑی تعداد میں اپنایا۔اگر چہ یہ عمل ایک لمبی جدوجہد کا نتیجہ تھا جس میں میوؤں نے جنگلوں کو صاف کر کے ہل چلانے کی تکنیک کو زراعت کے لئے استعمال کیا۔

اسی طرح پاہٹ میوؤں نے ساحر سرکار کے پرگنوں پہاڑی، کاماں، نگر اور کھومجاہد میں بہت سے دیہات پر انیسویں صدی کے نصف اخیر تک قبضہ کر لیا۔1840ء کی مردم شماری سے پتہ چلتا ہے کہ پرگنہ تاؤڑو کے 55 دیہات میں سے 47 اور پرگنہ سوھنا کے 169 دیہات میں سے 47 میوؤں کے قبضہ میں تھے۔یہ اس امر کا واضح اشارہ ہے کہ اکبر کی موت کے بعد ان پرگنوں میں میوؤں میں کاشتکاری کا رجحان زور پکڑ گیا تھا۔ضلع گوڑ گاؤں کے پہلے انگریز کلکٹر کا 1846ء میں کیا گیا مندرجہ ذیل مشاہدہ بھی میوؤں میں کاشتکاری کے بڑھتے رجحان کی تصدیق کرتا ہے۔

''میوؤں کو ان کی قانون شکن اور چوری کی فطری عادات کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے مگر اس حوالے سے اب ان کی نسبت گوجر اور رانگھڑ زیادہ بدنام ہیں۔میں نے فیروز پور سے زیادہ خوبصورت کاشتکاری پورے ہندوستان میں نہیں دیکھی جو میوا کثریتی پرگنہ ہے۔مٹی سے محبت اور جذباتی وابستگی اس قوم میں پورے ہندوستان میں سب سے زیادہ ہے۔''

اس حصے میں ہم نے دیکھا کہ پہلے مرحلے میں میوؤں میں کاشتکاری کا رجحان تجارہ سرکار میں زیادہ تھا جو خانزادہ سرداروں کا گڑھ تھا بعد ازاں میوؤں نے اپنی آبادیاں الور، ساحر اور ریواڑی سرکار کے علاقوں تک بڑھا لیں اس طرح میو آہستہ آہستہ اپنے پال کے نظام اور مستقل زراعت کے دیگر عناصر کی وجہ سے قبائلی بود و باش سے زرعی معاشرے کی طرف منتقل ہو گئے۔جگاؤں نے میو شناخت کی ہندو گوت سسٹم کی بنیاد پر نئی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا جس سے میوؤں کی سماجی زندگی میں بنیادی تبدیلی رونما ہوئی۔گاؤں کو آباد

کرنے والوں اوران کے ادوار کا جگاّ ریکارڈ میں اندراج ہے۔اس ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ میوؤں میں کاشتکاری کے رجحان کو پال سسٹم کی وجہ سے کافی مدد ملی کیونکہ قبائل کا کسی نہ کسی پال سے تعلق ہوتا تھا اوراس طرح اُنہوں نے مخصوص علاقے اور گاؤں میں آباد ہونے کو ترجیح دی۔ڈیمروت اور دوھلوت پال کے آبائی گاؤں کجھو تہ اور دوہا1423 میں آباد کئے گئے تھے۔اسی طرح نیکج اور نیملی جو کہ نیائی چھرکلوت اور پونگلوت پال کے آبائی گاؤں ہیں بالترتیب 1428 اور 1458 میں آباد کئے گئے تھے۔جگاّ ریکارڈ کے مطابق ان کے گوت گاؤں آباد کرنے والے سرداروں کے نام پر تھے۔مثال کے طور پر ایک پال اور گوت کا نام سردار چھرکن کے نام پر ہے۔اسی طرح دوھلوت پال کا نام بھی ایک سردار کے نام پر ہے۔ بہت سے گوت مختلف سرداروں کے نام پر تھے جیسے دوھل سے دوھلوت، منگ راج سے منگیر یا، بسیر سنگھ سے بسیر، مٹیا سنگھ سے مٹیاوٹ اور سُکھڑ سنگھ سے سُکھر اوٹ۔ساحر سرکار کے گاؤں سکت پور کھنگو الی باگھولا اور میر پور کا تعلق بہمناوت گوت سے ہے۔جگاّ ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ ان گاؤں کے میو پہلے برہمن تھے۔سماجی عدم تحفظ کے باعث وہ پاہٹ پال میں شامل ہوکر میو برادری کا حصہ بن گئے۔اہم بات یہ ہے کہ ہر میو خاندان کا کسی نہ کسی گوت سے تعلق ہے مگر ان میں سے بہت سے خاندان پال سسٹم کا حصہ نہ تھے۔یہ رجحان ظاہر کرتا ہے کہ میوؤں کے سماجی ڈھانچے کی تشکیل پال سسٹم کے علاوہ بھی ہوئی ہے۔

میوات کے علاقے کو تیرہ جغرافیائی خطوں ''میو پالوں'' میں تقسیم کیا گیا ہے ان میں سے بارہ کو پال اور ایک کو پلاکڑہ کہا جاتا ہے۔تاہم عملی طور پر یہ سب برابر ہیں۔اس کا پتہ نہیں چلتا کہ کب اور کیوں پاہٹ پال کو پلاکڑہ کہا جانے لگا۔اس حوالے سے ایک عام روایت یہ ہے کہ جب اکبر کے دور میں تمام میو پالوں نے اپنے اپنے علاقے تقسیم کئے تو پاہٹ پال کا نمائندہ تاخیر سے پہنچا اس وجہ سے طنزاً پاہٹ پال کو پلاکڑہ کہا جانے لگا۔مگر ایسا لگتا ہے کہ پاہٹ پال کے پلاکڑہ کہلانے کی وجہ کچھ تاریخی حالات ہیں۔ پاہٹ میو

تمدنی طور پر دیگر میو پالوں سے مختلف تھے۔ جغرافیائی طور پر بھی پاہٹ میو پرگنہ جات کاماں، پہاڑی اور ڈیگ کے رہائشی ہیں جو متھرا اور بھرتپور علاقہ برج کا حصہ تھے۔ دریا خاں میو اور شش بدنی مینی اور پانچ پہاڑ کی لڑائی کا تعلق پاہٹ میوؤں سے ہے۔ دریا خاں میو اور شش بدنی مینی کی پریم کہانی مینا اور پاہٹ میوؤں کے درمیان اختلافات کی نشاندہی کرتی ہے۔ دریا خاں میو کے دلہن کے گھر گوشت کھانے سے انکار پر تنازعہ شروع ہوا۔ کہانی پاہٹ میوؤں اور میناؤں کے درمیاں تہذیبی (کھانے کی عادات) اختلافات کی بھی نشاندہی کرتی ہے۔ پانچ پہاڑ کی لڑائی شاہجہاں کے دور میں مغل شاہی حکومت اور پاہٹ میوؤں کے درمیان اختلافات کا نتیجہ تھی۔ یہ مغل ریاست کے خلاف پاہٹ میوؤں کی زرعی بغاوت تھی۔ فارسی اور راجستھانی دستاویزات کے مطابق پاہٹ میوؤں اور مغلوں کے درمیان تنازعہ اُسی قسم کا تھا جیسا اورنگ زیب کے دور میں برج کے جاٹوں اور مغلوں کے درمیان تھا۔ راجستھانی ذرائع اس بات کی بھی تصدیق کرتے ہیں کہ اس زرعی بغاوت میں جو سترہویں صدی کے اخیر اور اٹھارہویں صدی کی ابتداء میں ہوئی پاہٹ میوؤں اور برج کے جاٹوں میں اتحاد تھا لہٰذا تہذیبی طور پر پاہٹ میوا پنی میو برادری کی نسبت جاٹوں کے زیادہ قریب تھے۔ انہی تمدنی اختلافات نے پاہٹ میوؤں کو سماجی طور پر دیگر میوؤں سے علیحدہ شناخت دی۔ پاہٹ میوؤں کی اس علیحدہ سماجی شناخت کی تصدیق راجستھانی دستاویزات سے بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا دیگر میو پالوں نے پاہٹ میوؤں کو پال کی بجائے پلاکڑہ کہنا شروع کر دیا حالانکہ میوات میں ان کی خاصی اہمیت تھی اور وہ بہت بڑے زرعی علاقے کے مالک تھے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ پاہٹ میوؤں نے ہمیشہ اس واقعے کی تردید کی ہے کہ اکبر کے دور میں میو پالوں کے دربار میں ان کا نمائندہ تاخیر سے پہنچا تھا۔ ان کا مئوقف ہے کہ میو پالوں کے دربار میں ان کی تاخیر سے حاضری کا کوئی سوال ہی نہیں اُٹھتا کیونکہ اکبر نے اُنہیں ایک خاص باعزت مقام دیا ہوا تھا جو

مندرجہ ذیل مقبول عام روایت سے ظاہر ہے۔ ؎

پانچ پہاڑ کی راجائی اور پُورو میو دلّی
آدھے اکبر بادشاہ آدھے پاہٹ ٹوڈرمل

ترجمہ: پانچ پہاڑ کی حکومت اپنی طاقت کی بنیاد پر اس مقام پر ہے کہ
آدھے حقوق اکبر بادشاہ اور آدھے ٹوڈرمل پاہٹ کو حاصل ہیں۔

کہا جاتا ہے جب یہ کہاوت اکبر اعظم تک پہنچی تو اُس نے ٹوڈرمل پاہٹ کو بلاوا بھیجا اور سوال کیا کہ کیوں اُس نے اپنے آپ کو مغل شہنشاہ کے برابر سمجھنا شروع کر دیا ہے۔

میو نے جواب دیا کہ میں پانچ پہاڑ کا زمیندار ہوں پیداوار کا آدھا حصہ میری ملکیت ہوتا ہے اور آدھا عالم پناہ کا حصہ اس طرح ٹوڈرمل پاہٹ نے شہنشاہ کو پیغام دیا کہ جس طرح اکبر مغل ریاست کا شہنشاہ ہے اسی طرح وہ اپنے علاقے کا بادشاہ (زمیندار) ہے۔ لہٰذا زمینی مالیے کے نصف پر اُس کا حق بنتا ہے۔ اکبر اعظم اس جواب سے اتنا خوش ہوا کہ اُس نے ٹوڈرمل کو جاگیر اور منصب عطا کیا۔ اس لوک روایت نے دیگر میو پالوں کو بھی یہ پیغام دیا کہ پاہٹ میو کسی بھی طرح ان سے کم تر نہیں۔

پاہٹ میوؤں کا دعویٰ ہے کہ اکبر کے دور میں ان کے سردار ٹوڈرمل کو اتنی اہمیت حاصل تھی کہ وہ مغل حکومت کے فوجی نظام میں منصب دار کے درجے پر فائز تھا۔ اس لوک روایت کو اگر دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ پاہٹ سردار اپنے علاقے کی آدھی پیداوار پر حق چاہتا تھا جبکہ مغل اس علاقے کو اپنے مالیاتی نظام کے تحت لانا چاہتے تھے۔ لہٰذا یہ کہنا درست نہیں لگتا کہ پاہٹ میوؤں کو پلاکڑہ ان کے نمائندے کی زمینوں کی الاٹمنٹ کے وقت تاخیر سے آمد کی وجہ سے کہا گیا بلکہ مختلف کلچرل شناخت کی وجہ سے پاہٹ میوؤں کا دیگر پالوں سے کم تعلق بطور ردِعمل بقیہ پالوں کی طرف سے پاہٹ میوؤں کے لئے پلاکڑہ کی اصطلاح کے استعمال کا موجب بنا۔ ایسا لگتا ہے پاہٹ میوؤں کی شہنشاہ کے

زمینیں الاٹ کرنے کے وقت تاخیر سے آمد والی روایت میراثیوں نے اٹھارہویں صدی کے اختتام اور انیسویں صدی کے آغاز کے دوران اختراع کی۔ اس وقت تک میوؤں کا پال سسٹم اپنی حتمی شکل اختیار کر چکا تھا اور ہر پال کا چودھری اپنے میراثی کے ذریعے پال کی عظمت کے قصوں کی تشہیر کرتا تھا۔ میراثی کا یہ اخلاقی فرض تھا کہ وہ پال کے مشہور لوگوں اور چودھری کی تعریف کے گیت گائے۔ اصل میں اس طریقہ سے پال کے چودھری اپنی سماجی، معاشی اور سیاسی طاقت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے اخیر سے انیسویں صدی کے شروع کے دور میں میو چودھریوں نے بھی راجپوتوں کی طرح زبانی تاریخ کو منظوم قصوں کی شکل میں گانے کے لئے میراثیوں کی سرپرستی شروع کر دی تھی۔ بھرتپور کے جاٹوں کے اثر کی وجہ سے میراثیوں سے پرانے ہیروز کے قصے اور گیت سننے کی روایت سب سے پہلے پاہٹ میوؤں میں شروع ہوئی۔

شواہد سے یہ بات ثابت ہے کہ پانچ پہاڑ کی لڑائی اور دریا خاں کی داستانِ محبت میراثیوں نے اٹھارہویں صدی کے اواخر یا انیسویں صدی کے شروع میں بنائی تھیں۔ ایک اور مقامی تاریخی کہانی حسن خاں کی کتھا میں پاہٹ پال کے علاوہ تمام میو پالوں کا ذکر ہے۔

کہانی کے مصنف کے مطابق حسن خاں نے خانوا کی جنگ میں جانے سے پہلے تمام بارہ پالوں کے چودھریوں کو اپنے دربار میں بلایا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاہٹ میو سماجی طور پر دیگر میوؤں سے کٹے ہوئے تھے اور ممکن ہے یہ میو سماج کا حصہ اٹھارہویں صدی کے بعد بنے ہوں۔

منظوم گیتوں میں جب بھی زمینداروں کا ذکر آتا ہے تو اُنہیں راؤ، راجہ، مَلّ، سردار اور ٹھاکر کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔ حقیقت میں ریاست بھرتپور کے سرداروں کو اس طرح کے ناموں سے مخاطب کیا جاتا تھا مثلاً راؤ چوڑامن، راؤ بدن سنگھ، ٹھاکر بدن سنگھ، راجہ محکم سنگھ اور راجہ سورجمل وغیرہ۔ پاہٹ میوؤں کے قصوں میں بھی انہی خطابات کو استعمال کیا

جاتا ہے۔ تمام پالیں چار گروپوں میں تقسیم تھیں اور ہر گروپ کا راجپوتی بنس (قبیلے کا نام) کی بناء پر نام تھا۔ تمام پالوں کے لوگ اپنا تعلق متعلقہ راجپوتی بنس سے بتاتے تھے۔ اس کے علاوہ میوات میں بہت بڑی تعداد ایسے میوؤں کی ہے جو اپنا تعلق کسی پال سے نہیں جوڑتے اور نیپالیہ (بغیر پال کے) کہلاتے ہیں۔ زیادہ تر میو تیرہ سماجی گروپوں میں تقسیم ہے جنہیں پال کہا جاتا تھا۔ ہر پال کا ایک مخصوص علاقہ تھا۔ پال کے نظام کے تحت میوؤں نے مضبوط سماجی دھڑے بنا لئے تھے کیونکہ وہ اپنے ہم قبیلہ افراد کو ایک ہی مورث کی اولاد مانتے تھے۔ ابتدائی مراحل میں پال ایک قبائلی سماجی گروپ تھا جس میں ہر قبیلے کی اپنی آزاد شناخت تھی۔ قبیلے کا سربراہ پال کا سردار تصور ہوتا تھا۔

تیرہ میو پالیں راجپوتوں کے چندر بنسی اور سورج بنسی خاندانوں سے جڑی ہوئی تھیں۔ چھر کلوت، دوھلوت، ڈیمروت، نیائی اور پوندلوت پانچ میو پالوں کا تعلق جادو راجپوتوں سے جبکہ دیگر پانچ بالوت، دیڑوال، کلیسہ، لنڈاوت اور لٹاوت کا تونو راجپوتوں جو چندر بنسی خاندان سے ہیں سے تعلق تھا۔ دو میو پالوں کا تعلق کچھواہا راجپوتوں اور پاہٹ میو پال کا چوہان راجپوتوں سے تعلق تھا جو سورج بنسی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ میوؤں کو یہ نئی سماجی شناخت زمینداری کی طرف آنے کے بعد ملی۔ مختلف راجپوت قبائل سے نکلنے والی اس شناخت کی ساخت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کاشتکاری کی طرف اکٹھے نہیں آئے بلکہ یہ عمل مختلف ادوار میں جاری رہا اور میو مختلف گروپوں میں تقسیم ہو گئے اس طرح جگاؤں نے میوؤں کی سابقہ قبائلی شناخت کو نئی شاندار ماضی والی شناخت سے تبدیل کر دیا۔ ریاست نے بھی شاید اس عمل میں مدد فراہم کی تاہم ایسا صرف میوؤں کے ساتھ ہی نہیں ہوا بلکہ میناؤں نے بھی راجپوت قبائل سے تعلق ظاہر کر کے اپنی شناخت تبدیل کر لی۔ مشرقی راجستھان کو زرخیز زرعی علاقہ تصور کیا جاتا ہے جس کے بڑے حصے پر میو اور مینا کاشت کاری کرتے تھے مزید یہ کہ اس حصے کا انتظام راجپوتوں کے پاس تھا۔ سلطنت کے دور سے

قبل بڈگوجر اور جادو (سُر اسینا) راجپوت اس علاقے کے حکمران تھے مگر فیروز شاہ تغلق سے اکبر کے دور تک خانزادوں نے اس علاقے پر حکومت کی۔ خانزادے اصل میں جادو راجپوت تھے جنہوں نے فیروز شاہ تغلق کے دور میں اسلام قبول کرلیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جگاؤں نے ریاست کی مدد سے پانچ پالوں کو جادو راجپوتوں سے منسلک کر دیا ہو تا کہ ریاست کو قانونی حیثیت مل سکے یا خانزادہ ریاست کی سماجی بنیاد مضبوط ہو سکے۔ مغلوں کے دور میں یہ علاقہ کچھواہوں اور دیگر شاہی منصب داروں کی تنخواہ جاگیر میں شامل تھا۔ اٹھارہویں صدی کے اخیر میں نروکا (کچھواہہ) راجپوتوں نے ریاست الور قائم کر لی جس میں میو بہت بڑی تعداد میں آباد تھے۔ اس طرح سے میوؤں اور میناؤں کے راجپوت نسل سے تعلق کی افسانوی روایات نے راجپوت ریاست کے پھیلاؤ اور سماجی و معاشی ترقی میں اہم مدد فراہم کی۔

میوؤں کی راجپوت بنیاد اور دیگر ہندو گوتوں سے تعلق نے ان کی نئی سماجی شناخت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا جو پچھلی شناخت سے سماجی طور پر بلند تھی۔ نئی شناخت کے زیر اثر نہ صرف ہندو گوت اختیار کئے گئے بلکہ ہندو تہوار، ہندو رسم و رواج بھی اپنے لئے گئے۔ اس طرح مغل دور میں میوؤں نے بہت سے ہندوانہ طور طریقے، روایات اور تہوار منانا شروع کر دیئے۔ برہمنوں نے ان کی سماجی اور تہذیبی زندگی میں اہم کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ نو آبادیاتی دور سے پہلے ہندوستان کے دیگر حصوں میں بھی کئی دیگر قبیلوں نے کا شتکاری کی طرف تبدیلی کے عمل میں افسانوی روایات کا سہارا لے کر راجپوت بننے کی کوشش کی اور اپنی نئی سماجی شناخت کی تشکیل میں ہندو رسم و رواج کو اپنا لیا۔ ان میں سے کچھ قبیلے اپنے لئے علیحدہ ریاستی نظام قائم کر کے راجپوتی کے مقام تک پہنچ بھی گئے جبکہ بقیہ اس کوشش میں ناکام رہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ میوؤں کا راجپوت ہونے کا دعویٰ بھی صرف اس وجہ سے ناکام ہوا کہ وہ اپنے لئے کوئی علیحدہ ریاست قائم نہ کر سکے تھے۔ یہی معاملہ میناؤں کے

ساتھ ہوا کیونکہ وہ بھی قبائل سے کاشتکاری کی طرف تبدیلی کے عمل میں اپنے لئے علیحدہ ریاست قائم کرنے میں ناکام رہے تھے۔ میناؤں کے حوالے سے ہوئی تحقیق سے بھی اسی قسم کے دلچسپ حقائق کا اظہار ہوا ہے۔

یہاں پر شیل مایارام کی طرف سے میوؤں کے پال سسٹم کے حوالے سے اُٹھائے گئے کچھ اہم نکات کا ذکر بھی ضروری ہے۔ان کا مئوقف ہے کہ میو پال کی خودمختاری ایک روایتی حقیقت ہے جو کلی اختیار والے مرکزی اقتدار اعلیٰ کے خلاف ہے اور طاقت کی تقسیم چاہتی ہے۔ یہ ان کے صدیوں سے نہ تبدیل ہونے والے کردار کا خاصا ہوتا ہے۔ یہ اس پال سسٹم کی فطرت میں شامل تھا کہ وہ طاقتور مغل اور راجپوت ریاستوں پر حملے کریں اور ان کا مقابلہ کریں۔ مایارام کے نقطہءنظر کو تاریخی حقائق کی روشنی میں پرکھنا دلچسپ ہوگا۔ پال ایک ایسی سماجی اکائی ہے جس کی بنیاد مضبوط بھائی چارے اور ایک مورث کی اولاد ہونے پر ہوتی ہے اگرچہ لغوی طور پر اس کا مطلب قبائل کا ایسا اکٹھ ہے جن کا مورث ایک ہو۔ میوؤں کی طرح مینا اور بھیل برادریاں بھی پالوں میں تقسیم ہیں۔ میوؤں کا پال سسٹم ان کے کاشتکاری اختیار کرنے کے بعد سے ایسی تبدیلیوں سے گذرا ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ پہلی تبدیلی ان کی قبائلی شناخت میں ہوئی۔ زمیندار طبقے کی ترقی کے ساتھ ہی پال سسٹم میں بھی کچھ تبدیلیاں آ گئیں۔ بہت سے میو کسان جو نیپالیہ کہلاتے ہیں پال سسٹم کی حدود سے باہر ہی رہے۔ قبائلی معاشرے میں پال کے چودھری کی حیثیت قبائلی سردار کی سی تھی جو فیصلہ سنانے سے پہلے پال کے اہم ممبران (تھانمبا) سے مشورہ کرتا تھا۔ اُس کا اہم ترین فرض قبیلے کو بیرونی خطرے سے بچانا اور دیگر ممبران کی مدد سے چھاپہ مار دستے ترتیب دینا تھا۔ جیسے ہی میو کاشتکاری کی طرف مائل ہوئے پال کے چودھری کی طاقت بھی ختم ہوگئی اور ان کے اختیار کی نوعیت بھی تبدیل ہوتی چلی گئی۔

اب چودھری کو اپنے خاندان کی روزی روٹی کے لئے لوٹ مار کی بجائے کاشت کی گئی

فصلوں کے لئے برسات کی صورتحال اور فصلوں کے بیج کے لئے مہاجن پر انحصار کرنا پڑتا تھا کیونکہ لاچار چودھری مالیہ نہ ادا کرنے کی صورت میں نہ تو مقروض کسانوں کو سرکاری عمّال کے کوڑوں سے بچا سکتا تھا اور نہ ہی ان کا مالیہ ادا کر سکتا تھا۔ تبدیلی کے اس عمل میں خود کسان کو بھی طویل انفرادی جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ اب فصل کے تباہ ہونے یا قحط کی صورت میں کسان کے لئے لوٹ مار کرنا ممکن نہ رہا تھا لہٰذا وہ اپنے گاؤں کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ بطور پاہی کسان کھیتی باڑی کرنے پر مجبور ہوتا تھا۔ آگرہ اور دہلی کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے مغلوں کی میوات پر گرفت نسبتاً زیادہ مضبوط تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مغل دور کے فارسی اور راجستھانی ذرائع میں میوؤں کو ڈاکو اور لٹیرے نہیں لکھا گیا۔ تاہم راجستھانی دستاویزات میں اُنہیں باغی (مفسد) قرار دیا گیا ہے۔ یہ اصطلاح راجپوتوں (نروکا اور چوہان) کے لئے بہت زیادہ استعمال ہوئی ہے اسی طرح اسے میوؤں اور جاٹوں کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اصطلاح عمومی طور پر ہر اُس زمیندار اور کسان کے لئے استعمال ہوتی تھی جو مالیہ دینے میں ناکام ہو جاتا تھا یا ریاست کے احکامات ماننے سے انکاری ہو جاتا تھا۔ میوؤں کے ڈاکو اور لٹیرے کی اصطلاح سلطنت دور میں منہاجؔ سراج اور برنیؔ نے استعمال کی یا نوآبادیاتی دور میں انگریزوں نے۔ انگریزوں نے بھی اس اصطلاح کو برنیؔ اور منہاجؔ کی تحریروں سے ہی اخذ کیا تھا۔ بطور کسان مستقل آبادیوں میں رہنے سے میوؤں کی سماجی، معاشی اور تہذیبی زندگی ناقابل یقین حد تک بدل گئی تھی۔ تہذیبی اور سماجی نقطہء نظر سے میو قبائل سے زرعی معاشرتی نظام کا حصہ بن گئے تھے۔ ہندوؤں کی طرح اُنہوں نے گوت والی شناخت اپنالی اور میوات میں وہ ایک بالادست برادری کی شکل میں اُبھرے۔ ہندوؤں کی طرح اُنہوں نے تمام ہندووانہ تہوار اپنا لئے۔ اُن کی مذہبی و تہذیبی زندگی خاص طور پر شادی اور پیدائش کی رسومات میں میں برہمنوں کا کردار انتہائی اہم ہو گیا۔ ارستاً دستاویزات میں حاصل فروہی (جرائم کے ریکارڈ) کے مطابق میوؤں کے زمین، فصل اور

عورتوں سے متعلق تمام جھگڑے مغل عمّال کی ثالثی کے ذریعے حل ہوتے تھے۔

پال کے چودھری کی سرگرمیوں کے حوالے سے راجستھانی دستاویزات بالکل خاموش ہیں۔حقیقت میں اکبر اعظم نے چودھریوں کی خدمات مغل ریاست کا مالیہ اکٹھا کرنے کے لئے حاصل کر لی تھیں۔اس طرح چودھریوں کی حیثیت زمینداروں کی سی ہوگئی جن کی اہم ذمہ داری کاشتکاروں سے مالیہ اکٹھا کرنا تھا۔مغل سلطنت کے زوال کے بعد میوات کا بڑا حصہ ریاست الور کے قبضہ میں چلا گیا جبکہ پاہٹ میوؤں کا علاقہ ریاست بھرتپور کا حصہ بن گیا۔دونوں ریاستوں میں میوؤں پر مالیے کی مقدار اتنی بڑھا دی گئی کہ وہ ریاست کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔پال کے چودھریوں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا کیونکہ مغل ریاست کے زوال کے بعد ریاستی حکمرانوں نے اُنہیں اس ریاستی نظام کا حصہ نہ بنایا تھا جس میں وہ شامل تھے۔اس طرح پال کے چودھریوں نے اپنی اپنی پال کو منظّم کرنا شروع کر دیا۔ہم نے مغل دور میں میو کسانوں کے آپسی تنازعات کے حل کے سلسلہ میں پال چودھری کے کردار کو کھوجنے کی کوشش کی ہے۔کیا یہ چودھری ایک خودمختار حاکم کی طرح میو کسانوں کے تنازعات کا فیصلہ کرتے تھے جیسے مایا رام نے ظاہر کیا ہے؟ راجستھانی دستاویز ارستاّ کے حاصل فروہی خانے میں کاشتکاروں کے مختلف قسم کے تنازعات اور فوجداری مقدمات کا ذکر ہے جس میں ملزم کا نام اس کی ذات اور گاؤں کا نام بھی لکھا ہوا ہے۔اس خانے میں عامل یا فوجدار کی طرف سے جرم کی نوعیت کے مطابق دی گئی جرمانے کی سزا بھی روپوں یا ٹکوں میں درج ہے۔تارا میوڑا نے اپنی بیٹی کی منگنی موضع پہاڑی پرگنہ پنڈایاں کے مانا میو کے بیٹے کے ساتھ کی لیکن شادی کسی اور لڑکے سے کر دی۔مانا میو نے تارا میوڑا کی اس وعدہ خلافی کے خلاف سرکار (عامل کا دربار) میں شکایت درج کروائی جس کی تفتیش گاؤں کے پٹیل نے کی۔تارا میوڑا کو قصوروار پایا جا کر اُس کے قصور کی سزا دی گئی۔کسان معاشرے میں یہ ایک سنجیدہ معاملہ تھا اور منگنی توڑنے والے کو سماج اور برادری

کے شدید دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا تھا مگر اس معاملے کو حل کرنے میں پال کے چودھری کا کوئی کردار نظر نہیں آتا۔ ایک اور مقدمہ میں موضع نین پور پرگنہ ہرسانہ کا گووندا میو پینا میو کی بیوی کو بھگا لے گیا۔ پینا نے عامل کے دفتر میں شکایت کی۔ تفتیش میں گووندا قصوروار پایا گیا اور عامل نے اُس پر 11 روپیہ جرمانہ کر دیا۔ کسان معاشرے میں اس قسم کے مقدمات عام تھے مگر ہم دوبارہ دیکھتے ہیں کہ تنازعات کے حل میں چودھری کا کوئی کردار نظر نہیں آتا۔ موضوع سوہلپور پرگنہ کھوئری کے میو آپس میں لڑ پڑے۔ قصبہ کھوئری کے میوؤں کا بھی آپس میں جھگڑا ہوا۔ اسی طرح پرگنہ کھوئری میں میوؤں کی آپسی لڑائیوں کے اٹھائیس معاملات درج تھے جن میں عامل نے قانون شکنی کے الزام میں اٹھائیس روپے جرمانہ کیا۔ ان تمام مقدمات میں پال چودھری کا کہیں کوئی کردار نظر نہیں آتا۔

فصل، اناج اور مویشی چوری بھی میوؤں میں بہت عام تھی۔ پکڑے جا کر قصوروار ثابت ہونے پر ریاست چور کو سزا دیتی تھی۔ ایسا ہی ایک معاملہ موضوع میرھو پرگنہ پہاڑی کے جینا میو کا تھا جو گندم چرانے کے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ عامل نے اس کی سزا کے حوالے سے ایک انکوائری کی اور پھر اُسے پکڑ کر قید کی سزا سنائی گئی کیونکہ اُس نے اپنے ہی گاؤں کے ایک میو کسان کے گھر چوری کی تھی۔ جب عامل کے آدمیوں نے اُس کے گھر کی تلاشی لی تو کچھ بھی نہ برآمد ہوا کیونکہ جینا مسروقہ گندم کو پہلے ہی فروخت کر چکا تھا لہٰذا مسروقہ سامان کی برآمدگی پوری کرنے کے لئے عامل کے آدمی جینا کے گھر سے دو بیل لے گئے اور اُنہیں 12 روپے فی بیل کے حساب سے فروخت کر دیا۔ اسی طرح موضع کھیڑالی نائی پرگنہ منڈاور کے کوکا میو نے اپنے مینا ساجھی کا حصہ فصل چُرا لیا جرم ثابت ہونے پر ریاست نے اُس پر 5 روپے جرمانہ کیا۔ موضع کھوہ پرگنہ پہاڑی کے میو کسانوں کے ایک اور مقدمے میں ایک کسان نے اپنے پڑوسی کے کھیتوں پر قبضہ کر لیا۔ آخر کار قانون گو کی مدد سے عامل نے پٹواری کے ذریعے زمین پر قبضہ کرنے والے کے کھیت کی پیائش کروائی اور مدعی کو اُس کی

مقبوضہ زمین واپس کروائی۔

شیل مایا رام کے اس نقطہ نظر پر کہ پال کا چودھری میوؤں کے آپسی تنازعات کا ایک خودمختار حاکم کے طور پر فیصلہ کرتا تھا مغل دور میں میو معاشرے کی شادیوں میں کھلے پن کی بنیاد پر بھی سوال اُٹھتے ہیں۔ کسی بھی ذات کی عورت کو میو دلہن بنا کر گھر لے آتے تھے اور اُس سے پیدا ہوئی اولاد زمین میں برابر کی حقدار ہوتی تھی۔ اس تناظر میں میوات میں شاہ چوکھا کا فرقہ بہت مقبول ہوا تھا۔ جو میو مرد شادی کرنا چاہتے تھے شاہ چوکھا کے میلے میں جمع ہو جاتے تھے۔ کسی میو کی طرف سے بطور گھر بیچہ لائی گئی دلہن بھی مزار پر شاہ چوکھا کی دعائیں حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوتی تھی۔ ارستاّر یکارڈ کا گھر بیچہ کالم ظاہر کرتا ہے کہ میو کسی بھی ذات کی عورت کو اپنی بیوی بنا کر لے آتے تھے۔ قصبہ جبلپور میں بھجر و میو، چیتا گوجر کی بیوی کو اپنی دلہن بنا لایا۔ اس مقصد کے لئے اسے ریاست کو حاصل گھر بیچہ (دوسری شادی کا) ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ موجپور پرگنہ میں نورو میو ایک بھاٹ کی لُگائی کو دلہن بنا لایا اور ریاست کو حاصل گھر بیچہ ادا کر دیا۔ نورو میو نے اودا مینا کی بیوی حاصل کر لی۔ اسی طرح موضع بھادپورہ (پرگنہ منڈاور) کے دالو میو نے دیارام مینا کی بیوی سے بیاہ رچالیا۔ مغل دور میں گھر بیچہ یا گھریانہ کی رسم صرف میوؤں تک ہی محدود نہ تھی بلکہ کچھ دیگر درمیانی ذاتوں جیسے جاٹ، اہیر، گوجر اور مالی وغیرہ میں بھی تھی۔ اس رسم کے مطابق چھوٹے یا بڑے بھائی کی موت کے بعد بیوہ زندہ بھائی کی بیوی تصور ہوتی ہے۔ راجستھانی دستاویزات میں عورتوں کی فروخت کے بہت سے واقعات کا ذکر ہے۔ اس ضمن میں ہم ایک ہی عورت کی دو شادیوں کے واقعہ کا حوالہ دینا چاہیں گے کہ پہلے وہ کسی اور کی بیوی تھی مگر بعدازاں اُس کے شوہر نے اُسے فروخت کر دیا۔ ارستاّ دستاویزات اس قسم کے بہت سے واقعات بیان کرتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ عہدِ وسطیٰ کے کسان معاشرے میں عورت کی خرید و فروخت عام بات تھی عورتیں بچے پیدا کرنے اور زمیندارے میں ہاتھ بٹانے والی محض ایک چیز سمجھی جاتی

تھیں۔قبائلی مشابہت کی بنا پر انگریز ماہرینِ نسلیات سمجھتے تھے کہ میو اور مینا کا تعلق ایک نسل سے ہے۔اکبر کے دور کے دریا خاں میو اور رشش بدنی مینی کے واقعے کو مثال بنا کر وہ یہ دلیل بھی دیتے تھے کہ ان دونوں برادریوں کے درمیاں شادیاں کرنے کا رواج تھا۔دریا خاں میو اجان گڑھ کے زمیندار ٹوڈرمل پاہٹ کا بیٹا اور رشش بدنی راؤ بادامینا کی بیٹی تھی۔ٹوڈرمل پاہٹ اور راؤ بادامینا بھی آپس میں قریبی دوست تھے جنہوں نے اپنے بچوں کی آپس میں شادی طے کر دی۔شادی کے دوران میوؤں اور میناؤں کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔میناؤں نے سبزی خور میوؤں کو زبردستی گوشت کھلانے کی کوشش کی جس کی وجہ سے آپس کے تعلقات خراب ہو گئے اور آپسی شادیاں بند ہو گئیں۔

اس کہانی کی بنیاد پر انگریز ماہرینِ نسلیات نے دعویٰ کیا چونکہ دونوں کے درمیان شادیاں ہوتی تھیں لہٰذا میو اور مینا کا تعلق ایک نسل سے ہے۔مگر راجستھانی دستاویزات مندرجہ بالا کہانی کے اثرات کی تصدیق نہیں کرتیں کہ میوؤں اور میناؤں کے درمیان ایسی شادیاں ہونا بند ہو گئی تھیں کیونکہ بڑی تعداد میں مثالیں موجود ہیں اور رشش بدنی مینی کی کہانی کی بنیاد پر ہم نہ تو اس نظریئے کو مان سکتے ہیں کہ میو اور مینا کا تعلق ایک نسل سے ہے اور نہ ہی اس دلیل کو تسلیم کر سکتے ہیں کہ ان کے درمیان آپس میں شادیاں ہونا بند ہو گئی تھیں۔ایسا لگتا ہے یہ کہانی اس لئے مقبول ہوئی کہ اس میں دو اہم زمینداروں کا نام آتا تھا اور اس میں میوؤں اور میناؤں کی بڑی تعداد ملوث ہو گئی تھی۔بعدازاں میراثیوں نے اسے داستانِ محبت بنا دیا مگر یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ میو اور مینا کا تعلق ایک نسل سے ہے۔سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں حاصل گریچہ کے میوؤں سے متعلق بہت سے معاملات ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ میو نہ صرف میناؤں بلکہ جاٹوں، اہیروں، گوجروں، تیلیوں اور بھاٹوں سے بھی شادیاں کرتے تھے۔

میوؤں کے زرعی معاشرے کا جائزہ لینے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے ان کے شادی

بیاہ، اناج ومویشی چوری اور آپسی لڑائی جھگڑوں کو حل کرنے میں پال کے چودھری کا کوئی خاص کردار نہ تھا بلکہ ان جھگڑوں کا تصفیہ ریاست کی طرف سے عامل کرتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپسی تنازعات کے تصفیہ کے لئے میو پال چودھری کی بجائے ریاست سے رجوع کرتے تھے۔ مایا رام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ''میو پال شاہی نظام سے بالکل مختلف نسبتاً خود اختیار قومیت کی علاقائی اکائی ہے۔ میوؤں کے پال سسٹم کے بارے میں ان کی تحقیق یہ ہے کہ پال کے لوگوں کے درمیان فیصلے کرتے وقت پال چودھری ایک خودمختار بادشاہ کی طرح کام کرتا تھا۔ مگر ہمارے پاس مناسب شواہد موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کی ابتداء تک اس حوالے سے پال چودھری کا کوئی کردار نہ تھا۔ ممکن ہے کہ مغل دور میں اُنہیں زمینداروں کا مقام حاصل ہو جن کا اہم کام کسانوں سے مالیہ اکٹھا کرنا ہوتا تھا۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پال چودھری ''خودمختار بادشاہ'' کی طرح بالکل نہ تھا۔ ممکن ہے اُس نے یہ مرتبہ اٹھارہویں صدی کے بعد والے دور میں حاصل کرلیا ہو۔

شیل مایا رام کی ایک اور اہم دلیل یہ ہے کہ میو ہمیشہ ہی ریاست مخالف رہے اور چاہے مغل ہوں یا راجپوت میوؤں نے ان سے کبھی صلح نہ کی۔ ان کی یہ دلیل تاریخی حقائق کے خلاف ہے اُنہوں نے میوؤں اور ریاست کے درمیان مختلف النوع مذاکرات اور تعلقات کو نظر انداز کیا ہے۔ کوئی بھی کسان طبقہ چاہے وہ کتنا ہی باغی اور نافرمان ہو صرف مزاحمت کے ذریعے زندہ نہیں رہ سکتا۔ عام حالات میں یہ ریاست سے مذاکرات کے ذریعے اپنی شکایات مجاز حاکم تک پہنچاتا ہے تاکہ رعایت اور چھوٹ حاصل کر سکے۔ عرضی گزارنا کمزور کا اہم ہتھیار ہوتا ہے اور میوؤں نے اسے خوب استعمال کیا۔ آمیر کے سرداروں نے میوات کے کئی پرگنے مغل شہنشاہوں سے تنخواہ جاگیر میں حاصل کئے اور کچھ پرگنہ جات کے زمینداری یا اجارہ کے حقوق دیگر منصب داروں سے حاصل کر لئے تھے۔ ان

پرگنوں میں راجہ آمیر کے عمّال اکثر میو کسانوں پر غیر رواجی ٹیکس بھی نافذ کر دیتے تھے یا مالیہ وصولی کے نام پر زبردستی کرتے تھے۔ اس صورتحال میں میو راجہ آمیر کے ظلم کے خلاف مغل شہنشاہ سے شکایت اور اپیل کرتے تھے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ میو کسان کچھ رعایت کی خاطر اپنے پٹیلوں کو بھی ساتھ لے کر مغل شہنشاہ کے دربار میں پیش ہوتے تھے۔ بہت دفعہ ایسا ہوا کہ میو کسانوں نے مغل دربار میں شکایت کی اور شہنشاہ نے اُنہیں رعایت عطا کر دی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شیل مایا رام کی دلیل کے مطابق اگر میو مغل ریاست کی حاکمیت ہی نہیں مانتے تھے تو پھر اپنے مسائل کے حل کے لئے وہ مغل شہنشاہ کے سامنے کیوں پیش ہوتے تھے؟

1712ء میں آمیر کے راجہ نے شاہی منصب داروں سے پرگنہ تجارہ اور فیروز پور جھرکا کے اجارہ حقوق حاصل کر لئے اس طرح ان پرگنوں سے مالیہ اکٹھا کرنے کا حق راجہ آمیر کو مل گیا۔ جب آمیر کے راجہ نے اپنے دو عامل گوپی ناتھ اور انوپ سنگھ وکاوت ان پرگنوں سے مالیہ وصول کرنے کے لئے مقرر کئے تو میو کسانوں نے نئی تقرریوں کی مخالفت کی اور مالیہ دینے سے انکار کر دیا۔

جس پر فوجدار اپنے دستوں کو لے کر دیہاتوں میں جا پہنچا اور بہت سے میو کسانوں کو گرفتار کر کے عامل کے دفتر لایا اور جیل میں ڈال دیا۔ عامل نے اُنہیں اس یقین دہانی پر رہا کیا کہ وہ آئندہ ریاست آمیر کو مالیہ ادا کریں گے۔ اس وعدہ کے باوجود دونوں پرگنوں کے میو کسانوں اور پٹیلوں نے مغل دربار شاہجہاں آباد (دہلی) میں عرضداشت دائر کی اور وہاں مغل حکومت کے دیوان منعم خاں سے کہا۔

''ہمارا علاقہ شاہی منصب داروں کی جاگیر ہے لہٰذا ہم بادشاہ کی رعایا ہیں۔ آمیر سرکار ہم پر مختلف قسم کے ٹیکس نافذ کر رہی ہے۔ ہم پریشانی میں ہیں اور آپ سے مدد کے خواستگار ہیں۔'' میو کسانوں کی درخواست سننے کے بعد شہنشاہ نے منعم خاں کو حکم دیا کہ وہاں

آمیر ریاست کے عمّال کی بجائے شاہی عمّال مقرر کئے جائیں۔اسی طرح 1683ء میں پرگنہ فیروز پور جھرکا اور ملک پور کے میو کسانوں نے دہلی دربار میں مغل شہنشاہ کے حضور عرضداشت پیش کی ریاست آمیر غیر رواجی ٹیکس نافذ کر رہی ہے۔ یہ رپورٹ دیو داس ہرکارہ نے بھجوائی جو مندرجہ ذیل ہے۔

''پرگنہ فیروز پور اور ملک پور کے معاملات بہت خراب ہیں اور کوئی اُنہیں سمجھ نہیں پا رہا۔ کج فہم اور غداروں پر معاملات کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ کچھ ٹیکسز کی ادائیگی سے انکار کی وجہ سے ہمیں روزانہ بہت زیادہ نقصان ہو رہا ہے۔ان پرگنوں کی رعایا مغل شہنشاہ سے شکایت کرنے دہلی گئی ہے۔ان کی شکایت سننے کے بعد شہنشاہ نے فیصلہ کیا ہے کہ جزیہ ٹیکس رعایا کی بجائے صرف جاگیرداروں سے لیا جائے۔اس کے علاوہ رعایا نے نیوتا (شادی ٹیکس) ٹیکس اور گاڑا (چھکڑے پر ٹیکس) کی ادائیگی سے بھی انکار کیا ہے۔شاہی دربار سے ریاست آمیر کے وکیل کے نام حکمنامہ بھیجا گیا ہے کہ پرگنہ فیروز پور اور ملک پور کی رعایا نے ریاست کے خلاف شہنشاہ سے شکایت ہے لہٰذا رعایا کو مطمئن کریں اور افہام وتفہیم کے ذریعے معاہدہ کر کے ان کی رضامندی حاصل کریں۔''

رپورٹ سے واضح طور پر پتا چلتا ہے کہ ریاست آمیر کے غیر واجی ٹیکسوں کی مخالفت میں میوؤں نے مغل دربار میں شکایات درج کروائیں اور میو کسانوں کی عرضیاں سننے کے بعد شہنشاہ نے یہ غیر رواجی ٹیکس ختم کر دیئے۔میو کسان اس بات سے مکمل آگاہ تھے کہ ان کے گاؤں شاہی منصب داروں کی جاگیر کا حصہ تھے نہ کہ آمیر کے حکمران کی وطن جاگیر کا۔ مگر اُنہیں اس بات کا بھی پتہ تھا کہ گو ان کے گاؤں شاہی جاگیر کا حصہ ہیں مگر شاہی جاگیرداروں نے اُن کے گاؤں کے اجارہ حقوق آمیر کے راجہ کو دیئے ہیں۔اس طرح ان کا جاگیردار جو بھی ہو اُنہیں واضح پتہ تھا کہ ان کا حکمران مغل شہنشاہ ہے۔اسی لئے اُنہوں نے اپنی شکایات جاگیرداروں کی بجائے شہنشاہ کے دربار میں دائر کیں۔

1712ء میں شاہی جاگیردار سرفراز خاں نے اپنی جاگیر فیروز پور جھرکا راجہ آمیر کو اجارہ پر دے دی۔ اس صورتحال پر احتجاج کرتے ہوئے میو کسانوں نے شہنشاہ سے اپیل کی تاکہ شاہی جاگیردار پر دباؤ بڑھا کر اسے آمیر راجہ سے ہوئے معاہدہ کو منسوخ کرنے پر مجبور کیا جاسکے اور ان کے گاؤں اجارہ پر راجہ آمیر کے قبضہ میں نہ جائیں کیونکہ راجہ آمیر نے مختلف قسم کے غیر رواجی اور غیر قانونی ٹیکس ان پر نافذ کر دیئے تھے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا میوؤں کا پال سسٹم اور خودمختاری مغل دور میں کہیں نظر نہیں آتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مغلوں کے مالیہ وصولی اور جاگیرداری نظام نے میوات کے تمام دیہات کو انتظامی اکائیوں کے ساتھ منسلک کر کے اُنہیں پرگنوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس انتظامی ڈھانچے نے کسان سوسائٹی کو مالیہ وصولی مراکز کے ساتھ اس طرح باندھ دیا تھا کہ کسی بھی آزاد و خودمختار فیصلے کے لئے کوئی جگہ باقی نہ بچی تھی۔ مغلوں کے زوال کے بعد میو ریاست کے نہ قائم ہونے کی وجہ بھی یہی تھی کیونکہ میوات کا بہت بڑا حصہ الور سرکار کے 43 پرگنے بطور زمیندار نروکا راجپوتوں کے قبضہ میں تھے جنہوں نے آخرکار 1784 بکرمی میں ریاست الور قائم کر لی۔ جاٹوں کی پرگنہ جات کاماں، پہاڑی اور کھوئری میں زمینداریاں تھیں جنہوں نے ریاست بھرتپور کے قیام میں مدد فراہم کی۔ طاقت کے حصول کی یہ جنگ جس میں ریاستہائے الور و بھرتپور ایک طرف تھیں اور مغل سامراج دوسری طرف، میں میو کچلے گئے اور ان حالات میں ان کے لئے اپنی علیحدہ ریاست قائم کرنا ممکن نہ رہا تھا۔

کاشتکاری کی طرف تبدیلی کے عمل نے سولہویں سے اٹھارہویں صدی کے دوران میوؤں کی سماجی اور تمدنی زندگی میں بہت سی بنیادی تبدیلیوں کی بنیاد رکھی۔ سولہویں صدی کے اواخر میں میوؤں کے ایک گروپ نے شاہی ملازمتیں اختیار کیں اور مغلوں کے ساتھ مسلسل روابط کی وجہ سے اُنہوں نے اسلامی طور طریقے اپنانا شروع کر دیئے۔

آئینِ اکبری میں میوؤں کو دو گروپوں میں تقسیم دکھایا گیا ہے۔ (۱) زراعت سے

وابستہ کاشتکار اور بنیادی زمیندار گروپ۔ (ب) خدمتیا اور میوڑا شاہی ڈاک کا ترسیل کنندہ جاسوس اور شاہی محل کا محافظ گروپ۔

یہاں ہم میوڑا اور خدمتیا میوؤں کا ذکر کریں گے جنہوں نے مغل دور میں میوؤں اور میوات میں اسلامی تہذیب پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ فارسی اور راجستھانی ذرائع سے پتہ چلتا ہے کہ سلطنت کے زوال تک میوڑا اور خدمتیا میو محکمہ جاسوسی اور ڈاک کا لازمی حصہ تھے۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ یہ میوات کے قدیم باشندے ہیں اور اپنی دوڑ کے لئے مشہور ہیں۔ یہ طویل فاصلوں سے مطلوبہ اشیاء انتہائی توجہ سے لے آتے ہیں۔ یہ انتہائی قابل جاسوس ہیں اور پیچیدہ کاموں کو بھی اچھے انداز میں مکمل کر لیتے ہیں۔ یہ فرائض کی بجا آوری کے لئے ہر دم تیار رہتے ہیں۔ ان کی قوم چوری اور راہزنی کے لئے مشہور تھی اور سابقہ حکمران انہیں قابو کرنے میں ناکام رہے تھے۔ عالم پناہ کے موثر اقدامات نے انہیں ایماندار بنا دیا ہے اور اب یہ اپنی وفاداری کے لئے مشہور ہیں۔

تاریخِ اکبری کا مصنف کہتا ہے۔

''شہنشاہ اکبر نے چار ہزار دوڑنے والوں (ڈاک لے جانے والے) کو ملازم رکھا۔ یہ لوگ جاسوسی میں بھی ماہر ہیں اور دن رات عالم پناہ کی خدمت میں ہوتے ہیں اس طرح چاروں اطراف سے خبریں باقاعدگی سے ملتی رہتی ہیں۔ یہ لوگ ببّر شیر کی طرح تیز دوڑتے ہیں اس طرح دس دن کے اندر بنگال سے بھی جو آگرہ سے سات سو کوس دُور ہے خبر آ جاتی ہے اور عالم پناہ کو اچھے بُرے نفع نقصان ہر چیز کی خبر ملتی رہتی ہے۔''

عرفان حبیب کا کہنا ہے کہ ایک آدمی کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ایک دن رات میں 70 کوس (158 میل) کا سفر کر کے منزل تک پہنچ جائے۔ اس لئے ریلے سسٹم اپنایا گیا ہوگا۔ عارف قندھاری کی تحقیق بھی یہی ہے کہ اکبر نے ہر 5 کوس (11 میل) کے بعد ڈاک چوکی بنوائی تھی اور میوڑوں (پیدل دوڑنے والا) کے علاوہ ہر

چوکی پر دو گھوڑے بھی رکھے جاتے تھے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر نے مضبوط اور صحت مند میو نوجوانوں کو مغلیہ نظام ڈاک میں ملازم رکھا جو بھاگنے میں تیز ہوں اور ہر قسم کے موسم وجغرافیائی حالات میں زندہ رہ سکیں۔

اکبر نے محکمہ ڈاک کو ایک اہم ادارے کے طور ترقی دی کیونکہ مغلیہ سلطنت کے اتحاد و سلامتی کے لئے یہ بہت ضروری تھا مزید یہ کہ اس طرح اکبر نے نہایت کامیابی سے میو نوجوانوں کے حوصلے اور صلاحیت کو مغل ریاست کے وفادار اور بااعتماد ملازمین کی شکل دے دی۔ مندرجہ ذیل واقعہ اکبر کے میوؤں کے ساتھ نئے تعلقات کی شہادت دیتا ہے۔ 1567ء میں اکبر کو پتہ چلا کہ علی قُلی خان اور اس کا بھائی بہادر خان جو تورانی گروہ کے امیر تھے۔ باغی ہو گئے ہیں۔اس خبر کے ملتے ہی اکبر نے ان کے خلاف فوج کشی شروع کی اور مانکپور پہنچ گیا۔ وہاں سے اکبر نے ہتوا میوڑا کو باغیوں کی صحیح پوزیشن معلوم کرنے کے لئے بھیجا۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ ہتوا میورا ایک ذہین آدمی اور تیز رفتار قاصد کی طرح 24 گھنٹے کے اندر خبر لے آیا۔اُس نے شہنشاہ کو بتایا کہ باغی امراء نے سنگرور (موجودہ نواب گنج) کے قریب دریائے گنگا پر پل بنا کر دریا عبور کر لیا ہے۔ جب اکبر نے یہ خبر سنی اُس نے فوراً باغیوں کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔

ہتوا اکبر کا وفادار تھا اور ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتا تھا۔اکبر میوڑاؤں پر اتنا اعتماد کرتا تھا کہ اُس نے اُنہیں اپنے ذاتی محافظ بنا لیا تھا۔

ابوالفضل مزید لکھتا ہے کہ اکبر نے خدمتیا (پیادہ سپاہی) اپنے محل کے اردگرد تعینات کر رکھے تھے جن کا کام نگرانی، حفاظت اور یہ دیکھنا تھا کہ شہنشاہ کے احکامات مناسب طریقے سے لے جائے جا رہے ہیں۔اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر سمجھ گیا تھا کہ میوؤں کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے پچھلی صدیوں میں ان کا کردار مسائل پیدا کرنے والوں کا رہا تھا۔اُس نے نہ صرف انتظامی اور سیاسی طور پر علاقہ میوات کو مغل ریاست کا حصہ بنایا بلکہ

میوؤں کو سماجی طور پر بھی بلند کیا۔ اکبر نے میوڑاؤں کی مدد سے ڈاک کا جو نظام وضع کیا تھا دیگر مغل شہنشاہوں نے اس طریقہ کار کو جاری رکھا۔ خافی خان لکھتا ہے کہ اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں بھی میوڑا ڈاک لے جانے کا کام کرتے تھے۔ عرفان حبیبؔ نے مغلیہ دور کے ہندوستان میں میوڑاؤں کی بنیاد پر ڈاک کی ترسیل کے نظام کا تجزیہ کیا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ مغل سلطنت کی طرح بڑے ممالک میں محکمہء ڈاک بہت ضروری تھا کیونکہ خبریں اور احکامات بہت لمبے فاصلوں تک پہنچانے ہوتے تھے۔ یہ نظام دو جڑواں طریقوں ریلے ریس دوڑنے والے پیادوں اور گھوڑوں پر مشتمل تھا جو مختلف ڈاک چوکیوں پر تعینات تھے جو ساری سلطنت میں مغل شاہراہوں پر قائم تھیں۔ گجرات کے صرف ایک حصے میں خاندیپ (صوبہ اجمیر) سے احمد آباد اور پھر بڑودا اور بڑوچ) تک کی چوکیوں پر چورانوے میوڑا تعینات تھے۔ ہر چوکی پر کم از کم دو میوڑا لازمی ہوتے تھے کیونکہ اُنہیں چوبیس گھنٹے موجود رہنا پڑتا تھا۔ میوڑاؤں کو تحریری حلف نامہ دینا پڑتا تھا کہ وہ سرکاری ڈاک کے ہمراہ لوگوں کے ذاتی خطوط نہیں لے جائیں گے۔ بی ایل بھدانی نے 164 ڈاک میوڑاؤں کا ذکر کیا ہے جو آگرہ سے احمد آباد جانے والی شاہراہ پر تعینات تھے ان میں سے 77 کی چوکیوں پر ڈیوٹی تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آدھے میوڑا چوکیوں پر موجود رہتے تھے اور بقیہ آدھے شاید بطور ریزرو ڈیوٹی دیتے تھے۔ دستور کو موار جو کہ ریاست جے پور کی دستاویزات کا مجموعہ ہے سے پتہ چلتا ہے کہ دہلی سے جے پور اور جے پور سے آگرہ کی چوکیوں پر 200 میوڑاؤں کی ڈیوٹی تھی۔ ان میں سے کئی کو ریاست آمیر نے فرائض کو خوش اسلوبی سے ادا کرنے پر انعامات سے بھی نوازا تھا۔ لال چند میوڑا اور اس کا بیٹا اورنگ زیب کے دربار میں بطور جاسوس اپنی صلاحیتوں کے لئے مشہور تھے۔ اسی طرح اورنگ زیب نے خوجہ عیوض خاں میوڑا کو اس کی خدمات کے اعتراف میں پرگنہ جلال پور (الور سرکار) میں تین گاؤں کی جاگیر بطور انعام دی تھی۔ تارا میوڑا اور رام سنگھ میوڑا کو

بھی پرگنہ پہاڑی اور بھرکول میں بطور انعام ایک ایک گاؤں کی جاگیر دی گئی تھی۔ آئینِ اکبری میں میوڑاؤں کی ماہانہ تنخواہیں بھی لکھی ہیں جو اکبر کے دور میں 100 سے 120 دام (ڈھائی روپے سے تین روپیہ) تھیں۔ دستورِ کوموار میں بھی ذکر ہے کہ عام طور پر ڈاک میوڑاؤں کی تنخواہ 2 سے 4 روپیہ ماہوار تھی تاہم راجستھانی دستاویزات میں لکھا ہے کہ ڈاک میوڑا اپنے کام کی نوعیت کے پیشِ نظر زیادہ اُجرت بھی حاصل کرتے تھے۔

مثال کے طور پر 1714ء میں بھوجا اور مادھو میوڑا الٰہ آباد سے چھبیلا رام کا خط آمیر لائے تو ریاست آمیر کے دیوان نے اُنہیں اس کام کے 22 روپے ادا کئے۔ سُندر اور چیتن میوڑا کو شاہی منصب دار رہلا خان کا خط لانے کے عوض 14 روپے ادا کئے گئے جس میں پرگنہ چستو کے گاؤں ریاست آمیر کو اجارہ پر دیئے جانے کا حکم تھا۔ اسی طرح ہری رام میوڑا اور اُس کے ساتھی کو جو پرگنہ آوری، بھاسہڑی، نوائی اور فاگی کے زمینداری حقوق ریاست آمیر کو دینے کی بابت شاہی منصب دار کا حکم نامہ لائے تھے آمیر کے دیوان نے اضافی رقم ادا کی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاک میوڑاؤں کو یکساں تنخواہ نہیں ملتی تھی بلکہ خاص خدمات کے عوض اُنہیں اضافی رقم بھی ادا کی جاتی تھی۔ تنخواہ کے علاوہ ڈاک میوڑاؤں کو مغل ریاست کی طرف سے ان کی ذاتی جائیداد پر مالیہ کی ادائیگی میں بھی رعایت ملتی تھی۔ عاملوں کو ہدایت تھی کہ وہ قاضی سے تصدیق شدہ احکامات کی وصولی کے بعد اُن پر عملدرآمد کروائیں۔ بھوجا اور لادخاں میوڑا کو بالترتیب 10 اور 14 بیگھہ زمین پرگنہ بھرکول (سرکار تجارہ) میں بطور معافی دی گئی مگر یہ واضح نہیں ہے ڈاک میوڑاؤں کو یہ ٹیکس فری زمین (معافی بیگھے) بطور تنخواہ دی گئی یا بطور انعام۔ جیسے ہی ڈاک میوڑا مغل ریاست کی ڈاک خدمات سے ریٹائرڈ ہوتے تھے ان کی ذاتی جائیداد پر مالیہ کی رعایت خود بخود ختم ہو جاتی تھی۔

ڈاک میوڑاؤں کا تعلق قبائلی پس منظر والے میوؤں سے تھا جن کی مذہبی شناخت

تبدیلی کی حالت میں تھی۔ مغل ریاست کے محکمہ ڈاک میں ملازمت کو یہ اپنے لئے سماجی اور معاشی طور پر زیادہ سودمند سمجھتے تھے۔ معاشی نقطہءنظر سے ڈاک میوڑاؤں کو ماہانہ تنخواہ اور دیگرالاؤنس ملتے تھے۔اس کے لئے ان کی ذاتی جائیداد پر مالیہ کی ادائیگی میں بھی رعایت ملتی تھی۔ سماجی طور پر وہ معاشرے کے عام میوکسان سے برتر تصور ہوتے تھے لہٰذا جو بھی ایک دفعہ مغل حکومت کا ملازم ہوگیا اُس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اپنے خاندان کے دیگرافراد کو بھی محکمہ ڈاک میں ملازم کروائے۔ ایسا لگتا ہے کہ ڈاک میوڑا اپنے بیٹوں اور دیگر رشتہ داروں کو ملازمت دلوانے کے لئے مغل حکومت میں اپنا کچھ اثر رکھتے تھے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ وہ ڈاک کی ترسیل کے حوالے سے اپنا علم اور تجربہ اگلی نسل کو منتقل کر دیتے تھے جس سے مغل ریاست کے لئے وفاداری کے جذبات میں بھی اضافہ ہوتا تھا۔ انگریز ماہرین نسلیات نے لکھا ہے کہ میوؤں میں اپنے حکمرانوں کے لئے وفاداری اور اطاعت کا جذبہ موجود تھا۔ مغل دربار اور دیگر شاہی عہدہ داروں سے مستقل رابطے کی وجہ سے ڈاک میوڑا اسلامی تہذیب وتمدن کے نزدیک ہوتے چلے گئے۔ آہستہ آہستہ اُنہوں نے مغل دربار اور شاہی ملازمین میں رائج اسلامی رسم ورواج کو اپنانا شروع کر دیا۔ اسلامی تہواروں اور عبادات کی نوعیت ایسی تھی کہ ان کو مناتے وقت بہت بڑی تعداد میں لوگ شامل ہوتے تھے۔ ان مذہبی تہواروں میں عیدالفطر، رمضان کے روزے، شب برأت اور خواجہ معین الدین چشتیؒ کا عرس ایسے تھے جن میں بہت زیادہ لوگ شامل ہوتے تھے۔ شہنشاہ کے گھریلو ملازمین، محل کا سرکاری عملہ اور ذاتی محافظ ان تہواروں میں حصہ لیتے تھے۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ کا عرس مغل دربار میں اکبر کے دور سے ہی منایا جاتا تھا جس میں درباری امراء، درباری خدمتگار، خدمتیا، ذاتی محافظ اور ڈاک میوڑا شامل ہوتے تھے۔ یہ راستہ میوات سے گزرتا تھا۔ یہ لوگ خواجہ صاحب کا جھنڈا اُٹھا کر چلتے تھے اور راستے میں بہت سے لوگ جھنڈے کو تعظیم دیتے تھے۔ عیدالفطر اور رمضان کے روزوں میں بھی بڑی تعداد میں لوگ

شامل ہوتے تھے۔ ڈاک میوڑا اور خدمتیا (ذاتی محافظ، محافظ اور جاسوس) ان تہواروں کو بہت نزدیک سے دیکھتے تھے۔ شاہی ملازمت سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد وہ اپنے اپنے گاؤں میں ان تہواروں کو منانا شروع کر دیتے تھے۔ ان تقریبات میں وہ دوستوں اور رشتہ داروں کو بھی مدعو کرتے تھے۔ اس طرح ان سابقہ ڈاک میوڑاؤں نے جو مسلم معاشرے سے جڑے ہوتے تھے اپنے بچوں کی شادیوں پر قاضیوں کو بُلانا شروع کر دیا۔ خطوط اہلکاران کی دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ مغل ریاست کی طرف سے تعینات قاضیوں کو لوگوں کے درمیان تنازعات کا تصفیہ کرنے کی ذمہ داری دی جاتی تھی۔ دیوی داس ہرکارہ نے ریاست آمیر کے دیوان سے شکایت کی کہ

''قاضی اپنے دفتر بیٹھنے کی بجائے دیہاتوں میں لوگوں کے نکاح پڑھاتا رہتا ہے۔ مغل حکومت سے اُسے 240 روپے تنخواہ ملتی ہے۔ وہ بہت لالچی ہے۔ اسے اپنی ذمہ داریوں پر توجہ دینی چاہئے۔ آپ کو مغل دربار میں اپنے وکیل کے ذریعے قاضی کی شکایت کرنا چاہئے۔''

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں خانوا کی جنگ کے بعد خانزادوں کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور میوات مغل انتظامیہ کے کنٹرول میں چلا گیا۔ خانزادے مغل امراء کا حصہ بن گئے۔ مغلیہ حکومت کے زوال کے ساتھ ہی خانزادوں کی سماجی اور معاشی حیثیت بھی ختم ہوگئی۔

ارژنگِ تجارہ کا مصنف لکھتا ہے کہ اودھ، لکھنو اور بریلی سے ملحقہ مشرقی علاقوں میں آباد خانزادوں نے اپنی زمینوں کو خاندان کے دیگر افراد کی مدد سے خود کاشت کرنا شروع کر دیا۔ محمد مقدوم بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ اس سے قبل خانزادوں نے کبھی خود کھیتی باڑی نہ کی تھی مگر مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اُنہوں نے اپنے خاندانوں کی مدد سے زمینیں خود کاشت کرنا شروع کر دیں۔ خانزادوں کی سماجی حیثیت کو علاقہ میوات کی اُبھرتی

ہوئی طاقتوں (ریاست بھرتپور) جاٹ اور راجپوت (الور کی نروکا ریاست) سے شدید خطرہ تھا۔ اپنی سماجی حیثیت کو مستحکم کرنے کے لئے خانزادوں نے سابقہ ڈاک میواڑوں سے رشتے ناطے شروع کر دیئے جواب مسلم شناخت اپنا چکے تھے۔ انگریز سیٹلمنٹ افسر ایف سی کیننگ لکھتا ہے کہ مواضعات گھٹواسن، پال، نرائن باس، کھیرلی خورد اور محمد باس پرگنہ فیروز پور جھرکا کے میوؤں کا دعویٰ ہے کہ ماضی میں وہ خانزادے تھے۔ میوؤں سے شادی بیاہ کے بعد وہ میو برادری میں ضم ہو گئے۔ ارژنگِ تجارہ میں بھی لکھا ہے کہ دولوت اور گوروال میوؤں کی خانزادوں سے رشتہ داریاں تھیں۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام خانزادوں نے میوؤں سے رشتے ناطے کرنے شروع کر دیئے تھے لیکن خانزادوں اور ڈاک میوڑاؤں کے بیچ ہوئے رشتے ناطوں نے میو برادری میں اسلامی تمدن کے پھیلاؤ کی حوصلہ افزائی کی۔ جگاؤں کو دستاویزات ظاہر کرتی ہیں کہ اٹھارہویں صدی کے شروع تک میوؤں نے اسلامی نام رکھنا شروع کر دیئے تھے۔ (چارٹ دیکھئے)

میوؤں میں ٹوٹی پھوٹی اسلامائزیشن کے بارے میں انیسویں صدی کے نصف آخر میں میجر پاؤلیٹ لکھتا ہے۔

''میواب نام کے مسلمان ہیں لیکن ان کے گاؤں کے رسم ورواج ہندوؤں کی طرح کے ہی ہیں۔ یہ کئی ہندو تہوار مناتے ہیں۔ لہٰذا ہولی جو موسمی تہوار ہے محرم وعید اور شب برأت کی طرح اہم سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ جنم اشٹمی، دسہرہ اور دیوالی بھی مناتے ہیں۔ پرگنہ تجارہ کے 52 دیہاتوں میں سے صرف آٹھ گاؤں میں مسجدیں ہیں۔

خاندانی شجرہ	گوت	گاؤں کا نام	گاؤں کی آبادکاری کی تاریخ
1- مان سنگھ اُمید سنگھ مختیار سنگھ	سوگن	ماچا	1467 عیسوی/ 1524 بکرمی

مان سنگھ

سالار سنگھ

رائے مل

محمد خاں، ناہر خاں

-2 چوہڑ سنگھ " " " چوہڑ پُور 1448 عیسوی/ 1505 بکرمی

لوٹ سنگھ

ٹوڈر مل

مواسی

مُہر سنگھ

محراب سنگھ

امام بخش، ملے خاں

-3 پتھو سامل رٹاوت پتھرائی 1465 عیسوی/ 1532 بکرمی

جسونت سنگھ

ہری سنگھ

دھن سنگھ

امراؤ سنگھ

خُدا بخش، چھوٹے خاں

-4 چاند سنگھ سینگل چاندولی 1465 عیسوی/ 1532 بکرمی

رنبیر سنگھ، بھان سنگھ

ویر بھان

امر سنگھ

منگل سنگھ

رُستم، اسماعیل خاں

ذریعہ: یہ معلومات جگدیش جگا ولد گھڑی رام ساکن موضع گھٹیٹا کلاں تحصیل رام گڑھ ضلع الور کی
پوتھی (شجرہ نسب کی کتاب) سے لی گئی ہیں۔

ایف سی کیننگ 1877ء میں نوح اور فیروز پور جھرکا کے میوؤں کے بارے میں لکھتا ہے۔

''یہ صرف نام کے مسلمان ہیں اور ان کے بہت سے رسم و رواج اپنے ہندو ہمسایوں کے سے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان کا مطمع نظر یہ ہے کہ تہوار اور دعوتیں دونوں مذاہب کی کھاؤ روزے کسی کے نہ رکھو۔ حال میں کچھ میوؤں نے رمضان کے روزے رکھنے اور گاؤں میں مساجد بنا کر نماز پڑھنا شروع کر دی ہے اور ان کی بیویوں نے ہندی گھاگھرے کی جگہ شلوار پہننا شروع کر دی ہے۔ یہ تمام نشانیاں مذہب کے احیاء کی ہیں۔''

دوسری طرف میوؤں کی زندگی میں بہت سے غیر اسلامی طریقے لگی بندھی رسمیں شامل تھیں۔ انہوں نے بہت کم اسلامی طریقوں کو اپنایا تھا۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی کی ابتداء تک میوؤں میں اسلامائزیشن کا عمل بہت سُست تھا مگر اس عمل نے یقینی طور پر میوؤں کو میوات کی دیگر غیر مسلم اقوام سے علیحدہ تشخص فراہم کر دیا تھا۔ اس حوالے سے 1902ء میں ہوا ایک واقعہ بہت اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ 1902ء میں قصبہ ٹپوکڑا کے میلے کے دوران کچھ مسلمان تاجروں نے جو کہ مقامی سرائے میں ٹھہرے ہوئے تھے نماز پڑھنے کے لئے بہت اونچی آواز میں اذان دی۔ مقامی لوگ اذان کی آواز سن کر بہت حیران ہوئے کیونکہ اُنہوں نے اس سے قبل اذان نہ سنی تھی۔ مقامی لوگوں نے

اذان دینے کی مخالفت شروع کر دی۔ اذان کی مخالفت کو للکارتے ہوئے اردگرد کے 360 دیہات کے میو جمع ہوئے اور ایک روپیہ فی کس کے حساب سے چندہ جمع کر کے اُس جگہ مسجد بنانے کا اعلان کر دیا۔ اُنہوں نے وہ جگہ 700 روپے میں خرید لی جبکہ عام حالات میں اس جگہ کی مالیت 100 روپیہ سے زیادہ نہ تھی۔ اس واقعے نے اتنا مذہبی تعصب پھیلا دیا کہ الور کے راجہ کو مداخلت کرنا پڑی۔ غور طلب بات یہ ہے کہ مقامی لوگوں نے اس سے پہلے اذان ہی نہ سنی تھی جبکہ اردگرد کے دیہات میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد آباد تھی۔ جیسا ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں ایسا لگتا ہے کہ اسلامائزیشن کی نوعیت و ترتیب بہت عجیب تھی۔ مسلم شناخت اپنا لینا اس علاقے میں مسلمان ہونے کی بہت بڑی نشانی نہ تھی۔

قبولِ اسلام کے حوالے سے میوؤں میں دو کہانیاں بہت مقبول ہیں۔ پہلی کہانی کے مطابق میوؤں نے سالار مسعود کے زیرِ اثر اسلام قبول کیا جبکہ دوسری روایت یہ ہے کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے سفر اجمیر کے دوران میوات سے گزرے اور اُنہوں نے میوؤں کو مسلمان کیا۔ یہ کہانیاں بقیہ مسلمان معاشرے کو یہ باور کرانے کی کوشش کہی جاسکتی ہیں کہ میوؤں کو نچلے درجے کا مسلمان نہ سمجھا جائے کیونکہ ان کے قبولِ اسلام سے مشہور صوفی بزرگوں کا نام جُڑا ہے۔ اس قسم کے دلائل تبدیلیٔ مذہب کو جواز دینے کے لئے گھڑے گئے کیونکہ میو بہت بعد میں مسلمان ہوئے تھے۔

انگریز نوآبادیاتی ماہرینِ نسلیات کا خیال ہے کہ میوؤں نے سلطان بلبن (1287ء-1206ء) کے ظلم و ستم کی وجہ سے اسلام قبول کیا۔ تاہم بلبن کے دور تک میو نہ تو کسان بنے تھے اور نہ ہی علیحدہ قومیت۔ مزید یہ کہ ہندفارس وقائع جیسے برنؔی اور منہاجؔ میں کوئی ذکر نہیں کہ بلبن نے زبردستی میوؤں کو مسلمان کیا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ میوؤں نے اکبر کے دور (1605ء-1556ء) میں پالوں کی علاقائی تقسیم کے وقت اسلام قبول کیا تھا تاہم یہ نقطۂ نظر بھی قابل یقین نہیں کیونکہ اکبر کی مذہبی پالیسی میں کوئی تعصب نہ تھا بلکہ سب

کے لئے یکساں تھی۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ میو اورنگ زیب کے عہد (1707ء-1657ء) میں مسلمان ہوئے تھے۔ وہ الزام لگاتے ہیں کہ اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی چونکہ غیر مسلموں سے تعصب اور تنگ نظری پر مبنی تھی اس لئے میو مسلمان ہوئے۔ ہمیں راجستھانی ذرائع خاص طور پر دستور کوموار اور ارستآر یکارڈ یا کسی دیگر ذریعہ سے اس نقطہ نظر کی تائید میں کوئی شہادت نہ ملی ہے۔ ان دستاویزات سے ہمیں میو کسانوں کی اسلامی شناخت کا کوئی سراغ نہ ملا ہے بلکہ ان دستاویزات سے ہمیں کچھ شہادتیں میو کسانوں کی مذہبی اور سماجی شناخت کے حوالے سے ملی ہیں تاہم سترہویں صدی کے اواخر اور اٹھارہویں صدی کے شروع میں ڈاک میوڑوں کے ضمن میں پتہ چلتا ہے کہ اسلامائزیشن کا عمل شروع ہو چکا تھا اور میو نکاح، تدفین، عیدین کے تہواروں اور ناموں کے سلسلے میں اسلامی رسم و رواج کو اپنا رہے تھے۔ اسے ڈاک میوڑوں میں تہذیبی تبدیلی بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس طریقے سے ڈاک میوڑوں نے جن کا مغل دربار اور شاہی منصب داروں سے ان کی خدمات کے سلسلے میں خاص تعلق بن گیا تھا۔ اسلامی تہذیب وتمدن کو اپنانا شروع کر دیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے گاؤں میں آباد ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو مسلم معاشرے کا حصہ سمجھتے تھے اور اُنہوں نے مسلمان کسانوں سے رشتے ناطے شروع کر دیئے۔ اسلام کا اثر میو کسانوں پر بھی پڑنا شروع ہو گیا مگر 1840ء تک جب انگریزوں نے پہلی باضابطہ رپورٹ تیار کی پرگنہ فیروز پور جھرکا، نوح اور تاؤڑو کی ایک تہائی میو آبادی کو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ وہ مسلمان ہیں یا ہندو۔ اس بحث سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ میوؤں میں اسلامی شناخت اپنانے کا عمل اٹھارہویں صدی کے اخیر میں شروع ہوا اور بیسویں صدی تک جاری رہا۔

کیا میو ریاست کے مخالف تھے؟ اپنی تحقیق میں شیل مایا رام نے زور دیا ہے کہ میو ریاست کی اجارہ داری اور مرکزی اقتدار (مغل ریاست) کے خلاف تھے۔ اس تحقیق میں ہم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مغل حکومت کی وجہ سے میوات میں انتظامی اور

سماجی اتحاد قائم ہوا۔محکمہ ڈاک میں مستعدی کی خاطر اکبر نے بہت بڑی تعداد میں میوؤں کو بھرتی کیا اور یہ پالیسی مغل حکومت کے زوال تک جاری رہی۔ اکبر کے بعد دیگر مغل شہنشاہوں نے بھی محکمہءڈاک کی ملازمتوں میں میوؤں کو ترجیح دینا جاری رکھا۔

اس تحقیق میں ہم نے سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ کیسے میو کسان بننے کے عمل میں اسلام کی طرف بھی مائل ہوئے۔سب سے پہلے یہ کہ کھیتی باڑی شروع کرنے سے پہلے میوؤں کے مختلف قبائل میوات میں اراولی کی پہاڑیوں، وادیوں اور گھنے جنگلات میں آباد تھے۔ یہ قبائل مویشی چوری اور لوٹ مار میں ملوث تھے اور مداریوں، سپیروں اور شکاریوں کے طور پر بھی کام کرتے تھے۔ یہ ان کے ابتدائی پیشے تھے۔

علاقہ میوات سے گزرنے والے تاجروں کا کاروبار ان کی قانون شکن حرکات کی وجہ سے بری طرح متاثر تھا۔اس طرح میوؤں نے سلطنتِ دہلی اور خانزادوں کی ریاست کے لئے امن وامان کا شدید مسئلہ پیدا کیا۔نتیجتاً سلاطین دہلی اور خانزادوں نے میوؤں کی قانون شکنی کو روکنے اور اُنہیں قابو کرنے کے لئے سخت اقدامات کئے ہوں گے۔اس طرح میوؤں پر ان کے سابقہ پیشے کو چھوڑنے کے لئے سرکار کی طرف سے شدید دباؤ پڑا ہوگا لہٰذا اور کوئی راستہ نہ پا کر میو کھیتی باڑی کی طرف آ گئے۔ اگرچہ میوؤں کے کسان بننے کا عمل کافی لمبا اور تکلیف دہ ہے۔ یہ ان کی تاریخ کا انتہائی اہم اور انقلابی حصہ ہے۔ ریاست نے بھی میوؤں کو کسان بنانے میں اپنا کردار ادا کیا ہوگا تاکہ میوات کی زرعی معیشت مضبوط ہو اور زیادہ مالیہ اکٹھا کیا جا سکے۔اس ضمن میں خانزادوں کا کردار یقیناً انتہائی اہم ہے کیونکہ ریاست کی تشکیل کے لئے مضبوط زرعی بنیاد بہت ضروری تھی۔

ثانیاً میوؤں کی بڑھتی آبادی بھی ایک اہم عنصر تھا کیونکہ ان کے سابقہ پیشے اور پہاڑیوں کے محدود وسائل اب ان کی گزراوقات کے لئے ناکافی تھے لہٰذا اپنی بقاء کی جنگ میں زراعت نے اُنہیں ایک نئی اُمید دلائی۔اس طرح میوؤں نے پہاڑوں اور جنگلوں سے

رہائش ترک کر کے میدانوں میں آباد ہونا اور کھیتی باڑی شروع کر دی۔ آئینِ اکبری واضح تصویر کشی کرتی ہے کہ کس طرح میوؤں نے نہ صرف کاشتکاری شروع کر دی بلکہ میوات کے آدھے سے زیادہ علاقے کے زمینداری حقوق بھی حاصل کر لئے۔ میو کسانوں نے خوراک کے لئے فصلیں اُگائیں بلکہ بازار کے لئے نقد آور فصلیں بھی کاشت کیں۔ آئینِ اکبری اور دیگر ہم عصر فارسی ذرائع سے پتہ چلتا ہے کہ میوؤں کا ایک گروپ جسے ڈاک میوڑا کہا جاتا تھا مغلوں کے محکمہ ڈاک میں ملازم ہو گیا۔ ان کی اہم ذمہ داری مغل ریاست کے دور دراز علاقوں میں موسمی سختیوں کے باوجود ڈاک کی ترسیل تھی۔ میوؤں کا ایک اور گروپ جسے خدمتیا کہا جاتا تھا شہنشاہ کے ذاتی محافظ، شاہی محل کے نگہبان اور مغلیہ قلعوں کے محافظوں کے طور پر کام کرتا تھا۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ ڈاک میوڑا اور خدمتیا مغل ریاست میں سب سے وفادار، قابل اعتماد اور مستعد ملازم تھے۔ عارف قندھاری کے مطابق اکبر کے دور میں ان کی تعداد تقریباً 4000 تھی۔

میوؤں کی آئندہ تبدیلی کے حوالے سے تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ سلطنتِ دہلی کے دور میں میوؤں کو مویشی چور اور لوٹ مار کرنے والے سمجھا جاتا تھا جو اراولی کی پہاڑیوں اور جنگلوں میں جا کر چھپ جاتے تھے۔ پندرہویں صدی کے اختتام تک میو، میو کسان اور سپاہی میں تبدیل ہو گئے جبکہ سولہویں صدی کے اخیر تک میو زمیندار بن چکے تھے۔ میوؤں کے ایک گروپ نے مغل دربار میں اپنے آپ کو وفادار ملازم اور مستعد و بہادر ڈاک لے جانے والوں کے طور پر منوا لیا۔ میوؤں نے مغلیہ سلطنت کے زوال تک اپنی یہ شناخت برقرار رکھی۔ مغلوں کے زوال کے بعد میوات ریاستہائے الور و بھرتپور اور انگریزی علاقے میں تقسیم ہو گیا۔ اس تقسیم نے میوؤں کی دشواریوں کو بڑھا دیا اور ان کی جدوجہد کو مزید مشکل بنا دیا۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ میوؤں میں بعد ازاں ہوئے تمام تغیر و تحرک میں ان کے ریاستی طاقت کے ساتھ براہ راست تعلق کا کردار ہے چاہے وہ مغل ہوں یا خانزادے۔

شکریہ

میں مسلسل حوصلہ افزائی اور رہنمائی کے لئے پروفیسر دلباغ سنگھ کا دل کی گہرائیوں سے شکرگزار ہوں۔مختلف مواقع پر مدد کے لئے میں پروفیسر آر پی رانا، ڈاکٹر آر پی بہوگنا، پروفیسر یوگیش شرما، ڈاکٹر پرکاش، مسٹر پریم کمار، ڈاکٹر سبھاش چندر شرما، راجیش کمار، سوشیلا اور ڈاکٹر مایا نک کمار کا بھی مشکور ہوں۔ میں اپنے دوست پراگیان چودھری کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے مختلف مواقع پر میری مدد کی۔ راجستھان سرکار آرکائیوز بیکانیر کے حکام اور اہلکاروں کا بھی میں انتہائی خلوص سے ممنون ہوں۔

حوالہ جات

1- عبدالعزیز ''زرعی پیداوار کا تخمینہ میوات کے حوالے سے'' غیر مطبوعہ پی ایچ ڈی مقالہ، نارتھ ایسٹرن ہل یونیورسٹی شلوانگ 1981ء۔

2- چودھری عبدالرحمٰن چشتی ''مدعاتِ سعودی'' ایچ ایم ایلیٹ اور جان ڈاؤسن مرتبہ ''تاریخ ہند خود اس کے مورّخین کی نظر میں'' جلد نمبر 2، دہلی 2003ء، صفحات 49-513۔

3- ابوالفضل ''آئینِ اکبری'' جلد نمبر 1، ترجمہ ایم بلوچ مین ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ 1873ء مرتبہ ڈی سی فائلٹ کلکتہ 39-1927ء۔

4- ''آئینِ اکبری'' جلد نمبر 1، ترجمہ ایچ بلوچ مین ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ 1873ء مرتبہ ڈی سی فائلٹ کلکتہ 39-1927ء۔

5- اکبرنامہ، جلد نمبر 2، اشاعت ثانی 1989ء دہلی۔

6- عفیف ''تاریخ فیروز شاہی'' ایچ ایم ایلیٹ اور جان ڈاؤسن مرتبہ ''تاریخ ہند خود اُس کے مورّخین کی نظر میں'' جلد نمبر 3، نئی دہلی 2001ء۔

7- پرتاپ سی اگروال ''کاسٹ'' ریلیجن اینڈ پاور این انڈین کیس سٹڈی، نئی دہلی 1971ء۔

8- امیر خسروؒ ''خزینہ ءفتوح'' ایچ ایم ایلیٹ اور جان ڈاؤسن مرتبہ ''تاریخ ہند خود اس کے مورّخین کی نظر میں'' جلد نمبر 3، نئی دہلی اشاعت اوّل 1877-1867ء اشاعت

ثانی1990ء۔

9- بابر''بابرنامہ''ترجمہ اے ایس بیوریج دہلی2003ء۔

10- ضیاءالدین برنی''تاریخِ فیروز شاہی''ایچ ایم ایلیٹ اور جان ڈاؤسن''تاریخ ہند خود اس کے مورّخین کی نظر میں''جلد نمبر3 دہلی2003ء

11- بی ایل بھدانی''دی مغل ہائی وے اینڈ پوسٹ سٹیشنز ان مارواڑ''انڈین ہسٹری کانگریس1990ء،صفحات55-141۔

12- سورج بھان بھردواج''میوات کی سماجی اور معاشی حالت 1750-1650ء'' غیر مطبوعہ پی ایچ ڈی مقالہ سینٹر فار ہسٹاریکل سٹڈیز،سکول آف سوشل سائنسز جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی1990ء۔

13- کننگھم ایف سی''لینڈ ریونیو سیٹلمینٹ آف ضلع گوڑگاؤں''لاہور1877ء۔

14- اے کننگھم''اینول رپورٹ آف آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا''جلد نمبر20 وارانسی1969ء۔

15- اے فریزر''ضلع گوڑگاؤں کی اعداد وشمار میں رپورٹ''لاہور1877ء۔

16- عرفان حبیب''پوسٹل کمیونی کیشن اِن مغل انڈیا''انڈین ہسٹری کانگریس امرتسر 1985ء،صفحات52-263۔

17- ایس نورالحسن''فرد رلائٹ آن زمیندارز انڈر مغل''اے کیس سٹڈی آف مرزا راجہ جے سنگھ انڈر شاہ جہاں،انڈین ہسٹری کانگریس حیدرآباد1978ء۔

18- کے ایبٹسن''دی ریسرز کاسٹس اینڈ ٹرائبز آف دی پنجاب''لاہور(پنجاب) 1883ء۔

19- خان عنایت''شاہجہاں نامہ''ترجمہ اے آر فلر مرتبہ ڈبلیو ای بیگلے اور زیڈ اے ڈیسائی،دہلی1990ء۔

20- خافی خان ''منتخب اللباب'' جلد نمبر 1، ترجمہ سیّد انیس جہاں بمبئی 1977ء۔

21- سیتارام لالس ''راجستھانی ہندی سنکشیت شبد کوس'' جلد نمبر 2، جودھپور 1988ء۔

22- شیخ محمد مخدوم ''ارژنگِ تجارہ اردو، آگرہ 1875ء'' ہندی ترجمہ انیل جوشی الور 1989ء۔

23- جان میکلن ''پولیٹیکل ہسٹری آف انڈیا'' 1784ء تا 1823ء، جلد نمبر 2 لندن 1826ء۔

24- شیل مایا رام ''اگینسٹ ہسٹری اگینسٹ سٹیٹ'' کاؤنٹر پرسپیکٹو فرام کی ماجینز، دہلی 2004ء۔

25- شیل مایا رام ''ریزسٹنگ امیجیز'' متھ میموری اینڈ دی شیپنگ مسلم آئیڈینٹٹی، دہلی 1997ء۔

26- نرسنگھ میو ''حسن خاں کی کتھا'' شودھ پتریکا، جلد نمبر 4، صفحات 62-53، 1970ء۔

27- منہاج سراج ''طبقاتِ ناصری'' جلد نمبر 1، ترجمہ ایچ جی ریوڑے، اشاعت ثانی نئی دہلی 1970ء، اشاعت اوّل 1881ء۔

28- بھگوان داس موروال ''میواتی لوسہیتہ میں جیون درشن'' چھنگا رام مینا مرتبہ شرنجن بابو شوبھارام آرٹس گورنمنٹ کالج الور، 06-2005ء۔

29- ''تاریخِ محمدی'' ترجمہ محمد ذکی علی گڑھ 1972ء۔

30- محمد عمر ''اٹھارہویں صدی میں شمالی ہندوستان کا مسلم معاشرہ'' علی گڑھ 1998ء۔

31- صمصام الدولہ شاہ نواز خان ''معاصر الامراء'' جلد نمبر 1، ترجمہ ایچ بیورے مرتبہ بینی پرشاد پٹنہ 1979ء۔

32- محمد مخدوم ''ارژنگِ تجارہ'' الور 1989ء۔

33- پی ڈبلیو پاؤلیٹ ''گزیٹیر آف الور'' لندن 1878ء۔

34- محمد عارف قندھاری ''تاریخِ اکبری'' ترجمہ تسنیم احمد دہلی 1993ء۔

35- شرسوت راوت ''مینا اتہاس'' سمت 2057-2025 جے پور 1966ء۔

36- ایس ایچ ایم رضوی ''مینا دی رولنگ ٹرائب آف راجستھان''، دہلی 1987ء۔

37- جیمز سی سکاٹ ''غریب کے ہتھیار، کسانوں کی روزانہ بغاوت کی اشکال'' دہلی 1990ء۔

38- مہاویر پرشاد شرما ''میواتی کا اُدھبھو اور وکاس'' کوٹ پتلی جے پور 1976ء۔

39- نندنی سنہا ''ری کنسٹرکشن آئیڈینٹٹی اینڈ سٹیوشن دیم سیلوزان ہسٹری'' علاقہ جے پور کے میناؤں پر ایک ابتدائی نوٹ، انڈین ہسٹاریکل ریویو، جنوری 2000ء، صفحات 29-43۔

40- سرجیت سنہا ''سٹیٹ آف فارمیشن ان سینٹرل انڈیا'' مین ان انڈیا، جلد نمبر 42، 2 اپریل جون 1962ء، صفحات 80-42۔

41- او ایچ کے سپیٹ ''انڈیا اور پاکستان، عمومی اور علاقائی جغرافیہ'' لندن 1957ء۔

42- جیمز ٹاڈ ''تاریخِ راجستھان'' جلد نمبر 2 دہلی۔

43- جے فوربسز واٹسن اور ڈبلیو کے جانز ''ہندوستان کے لوگ'' جلد نمبر 4، 1869ء۔

44- یحییٰ بن احمد بن عبداللہ سرہندی ''تاریخِ مبارک شاہی'' ترجمہ ایچ بیوریج دہلی 1996ء۔

☆.....☆.....☆

بنگلہ دیش اور پاکستان کا بحران

حمزہ علوی
ترجمہ: ڈاکٹر ریاض احمد شیخ

ایک طوفان کے ساتھ پاکستانی فوج نے مشرقی بنگال کے لوگوں کے خلاف کاروائی شروع کی؟ صدر ایوب خان کی حکومت کے خاتمے اور جنرل یحییٰ خان کے ملک میں مارشل لاء لگاتے ہوئے اختیار سنبھالنے کہ ٹھیک دو سال بعد اس فوجی کاروائی نے ملک میں جاری بحران کو ایک نئے مرحلے میں داخل کرتے ہوئے اس میں مزید گہرائی پیدا کر دی۔ یہ بحران ہے قومی تشخص کا۔ یہ بحران درحقیقت ان ابھرتی ہوئی جمہوری قوت ملک میں حکمران کرتی ہوئی نوکر شاہی فوجی (Oligarchy) کی حکمرانی کے خلاف ایک چیلنج بھی ہے۔

اس صورتحال کی سب سے غیر مبہم حقیقت یہ ہے کہ فوج نے اپنے حملے میں تمام لوگوں کے خلاف انتہائی ظالمانہ کاروائی کی ہے۔ اسی طرح سب سے زیادہ واضح اور صاف (clean) بات مشرقی بنگال کے لوگوں کا اپنے آپ کو اس ظالمانہ نظام سے آزاد کروانے کا حق ہے۔ لیکن اس کے اندرونی (underlying) تہہ کے معاملات بڑے ہی پیچیدہ ہیں۔ جہاں تک یہ معاملات ہیں اس میں اول بات علاقائی بنیادوں پر بڑھتی ہوئی اقتصادی تفریق جو کہ سرمایہ دارانہ ترقی کے عمل میں غیر منصفانہ نظام کا نتیجہ ہے۔ جبکہ دوسری طرف سماجی

بنیادوں پر مصارفی (utilatrian) تصورات (concept) کے تحت قومیت اور قومی نظریات کے تصور کے سوالات اور تیسری طرف پسماندہ اور غیر مراعاتی علاقائی گروہوں میں جداگانہ قومی شناخت کا احساس پیدا ہونا تھا۔ ربع صدی تک مشرقی بنگال کے لوگ جو کہ پاکستان کی کل آبادی کا ۵۴ فیصد تھے، اپنے جائز حقوق اور سرکاری ملازمتوں، نوکر شاہی اور فوج میں جائز ملازمتوں کے لیے مطالبات کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا مطالبہ ملک میں اقتصادی وسائل کے منصفانہ بنیادوں پر مختص کیے جانے اور ان کے علاقے سے رواں استحصالی طریقہ کار کو فوری طور پر تبدیل کرنے کا بھی تھا۔ اس جدوجہد کے دوران ہی انہوں نے اپنے جداگانہ ثقافتی اور لسانی بنیادوں پر اپنے لیے ایک جداگانہ قومیت کے تصور کو بڑی واضح شکل دے دی۔ بنگالیوں کی مارچ ۱۹۷۱ء میں فوج کے ساتھ شروع ہونے والی محاذ آرائی دراصل اسی جدوجہد کا نقطہ عروج تھا۔

پاکستانی فوج کی طرف سے مشرقی بنگال میں شروع کی گئی فوجی کاروائی کی تاریخ میں بڑی ہی کم نظیر دیکھنے کو ملتی ہیں کیونکہ یہ کاروائی پورے بنگالی دانشور طبقے کے مکمل خاتمے کے لیے شروع کی گئی تھی اس (Desperate) کوشش کا مقصد بنگالی لوگوں کی آواز کو خاموش کرنا تھا۔ ۲۵ مارچ کو رات کے اندھیرے میں جس طرح فوج نے خونی کاروائی کا آغاز کیا اسے مکمل طور پر بڑے (Systematically) ترتیب دیا گیا تھا۔ اس کاروائی میں پہلے سے نشاندہی کیے گئے سیاسی کارکنوں کے گھر، دانشوروں اور خصوصاً جامعہ (یونیورسٹی) سے تعلق رکھنے والے افراد کے گھروں کی تلاشی لی گئی اور چھاپے مارے گئے۔ فوج کاروائی کرنے والوں کا خیال تھا کہ بنگالی قوم پرستی کی اٹھنے والی آواز کے لیے ایک بڑی ہی محدود حمایت دانشوروں اور سیاستدانوں میں پائی جاتی تھی اور فوجی کاروائی کے ذریعے ان کے خاتمے کے بعد بنگال میں وہ دوبارہ ایک تابعدارانہ اور وفادار طبقے کو پیدا کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے اور مستقبل میں دوبارہ اس قسم کے کسی بھی چیلنج کو پیدا ہونے سے

روک دیں گے۔اس نپی تلی(Calculated) کاروائی کی اصل روح یہ تھی کہ کاروائی کے اختتام پر بچ جانے والے تمام لوگوں کی روح کو کمزور کرنا اور تمام لوگوں کی آواز کو خاموش کر دینا تھا۔

لوگوں نے اس کے خلاف مزاحمت کی۔لیکن فوج کی اس غیر امکانی کاروائی کے خلاف مزاحمت مقامی، اچانک اور غیر مربوط تھی۔ یہ بڑی دلیرانہ بات تھی کیونکہ مزاحمت کرنے والی اپنی آزادی کے لیے بڑے ہی محدود وسائل سے اور صرف اپنے جذبے اور زندہ رہنے کی آرزو کے تحت لڑ رہے تھے۔لیکن یہ بڑی سادہ لوحی ہوگی اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ مشرقی بنگال کی سیاسی قیادت اور خصوصاً عوامی لیگ کی قیادت جو کہ بنگالی قوم پرستوں کی ترجمان بن کر ابھری تھی وہ اس فوجی کاروائی کے متعلق کوئی بھی امکانی آگاہی نہیں رکھتی تھی یا اس نے مزاحمتی تحریک اور آزادی کے لیے کوئی تیاری نہ کر رکھی تھی۔

عوامی لیگ کی قیادت کی طرز سیاست کی جھلک شیخ مجیب الرحمٰن کی اس فوجی کاروائی کے خلاف مزاحمت کی صورت میں سامنے آئی جب وہ اس مزاحمتی تحریک کا بلا تضاد (undisputed) مقابلہ قائد کے طور پر سامنے آیا۔اس کو بروقت اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ فوجی کاروائی ہونے جارہی ہے۔ بات چیت اور گفت وشنید کے تمام امکانات اور ممکنات کے خاتمے کے بعد بھی وہ اپنی خواہش کے مطابق اپنے گھر پر موجود رہا اور گرفتاری کا منتظر تھا۔ سیاست کا یہ انداز ہ ماضی کے طرز سیاست کا تسلسل تھا جس میں مجیب کی تربیت ہوئی تھی۔گذشتہ نسلوں کے سیاستدان بھی اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سیاسی مفاہمت اور بات چیت کے دروازے کھلے رکھنے کے ساتھ ساتھ دھونس دھمکی کا استعمال بھی کرتے تھے اور کئی مرتبہ انہیں برطانوی قید خانوں (جیل) میں بھی بند ہونا پڑتا تھا۔اس طرح وہ آہستہ آہستہ برطانوی سرکار سے رعایت (concessions) لیتے ہوئے بالآخر حکومتِ اقتدار کے قریب ہوتے چلے جاتے تھے۔وہ اس طرح اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے آپ

کو بڑے تصادم اور آزادی کے لیے کسی انقلابی تحریک چلانے سے خود کو بچا لیتے تھے۔ برطانیہ سرکار کے لیے ان قوم پرست رہنماؤں سے بات چیت کرنا سہل تھا کیونکہ وہ اس 'قوم پرست' قیادت پر مکمل اعتماد کرتے تھے۔ کیونکہ اسی کے ذریعے وہ موجودہ سماجی ڈھانچے کو برقرار اور نئے آبادیاتی (neo-colonial) مفادات کو ان قوم پرستوں کے ذریعے احسن طریقے سے حاصل کر سکتے تھے۔ انہیں اس بات کا خوف لگا رہتا تھا کہ ان 'معتدل رہنماؤں' کی ناکامی کی صورت میں نعم البدل انتہائی انقلابی اور انتہا پسند (ریڈیکل) قوتیں تھیں جو کہ سماجی ڈھانچے کو بدل کر رکھ دیتیں۔

مشرقی بنگال میں صورتحال اس سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ اس سلسلے میں کہا جا سکتا ہے کہ عوامی لیگ کی بنگالی قوم پرست قیادت اور مغربی پاکستان کی انتہائی طاقتور مفاد پرست قوتوں کے درمیان کسی حد تک ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ اور ان دونوں میں سے کوئی بھی اس بات کا خواہش مند نہ تھا کہ حالات اس نہج پر پہنچنے چاہئیں جہاں کہ معاملات مشرقی بنگال کے انتہا پسندوں کے ہاتھ میں چلے جائیں جو کہ وہاں قائم سماجی نظام کے لیے خطرہ بن کر اس کو اتار پھینکیں۔ عوامی لیگ کی قیادت کے مشرقی بنگال کی 'مکمل علاقائی خودمختاری' کے مطالبات کی چمپئن اور ۶ نکاتی پروگرام پر ڈٹے رہنے کے پس پشت دراصل ان قوتوں کا خفیہ دباؤ تھا جو کہ دسمبر ۱۹۷۰ء میں ہونے والے انتخابات میں اس کی شاندار کامیابی میں سرگرم عمل رہے تھے۔ ان کی طرف سے یہ دھمکی موجود تھی کہ اگر عوامی لیگ مشرقی بنگال کے مطالبات سے دستبردار ہوئی تو وہ اس کو دیوار سے لگا کر خود آگے آ جائیں گے۔ ہم ان مطالبات کی نوعیت اور ان قوتوں کا بھی گہرائی سے جائزہ لیں گے جو کہ ان مطالبات کے پس پشت تھے۔ لیکن یہ بات ابتداء میں ہی واضح ہو جانی چاہیے کہ ان مطالبات میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو کہ مشرقی بنگال میں موجود سرمایہ دارانہ سماجی نظام کے لیے خطرہ اور جاگیردارانہ اشرافیہ (gentry) کے مفادات کے خلاف جاتی ہو۔ سب سے اہم بات یہ

ہے کہ عوامی لیگ کی قیادت کسی بھی صورت مغربی پاکستان کی منظّم فوج کے خلاف کسی بھی طرح کھلی جدوجہد کرنے کے حق میں نہ تھی۔ان کا مقصد تو محدود سطح پر علاقائی مفادات کے حصول کے لیے کوشش کرنا تھا۔اس کے منصوبے میں مکمل آزادی کا خیال بھی شامل نہ تھا۔ بہرحال تمام سیاسی جماعتوں کو اس صورت حال میں اس بات کا مکمل ادراک تھا کہ ٦ نکاتی پروگرام پر کسی بھی قسم کی پھرتی دکھانے کی صورت میں انہیں سیاسی قوتوں پر قائم رہنے والے اثر کو کھونا پڑتا۔جس کو وہ ہر صورت میں برقرار رکھنا چاہتے تھے۔مفاہمت اور بات چیت کی بنیاد پر تلاش کی گئی مصلحت دونوں گروہوں کے لیے قابل قبول تھی وہ صرف اس لیے نہیں کہ دونوں یہ چاہتے تھے کہ مشرقی بنگال کو انقلابی جدوجہد کے حوالے ہونے سے بچایا جائے بلکہ مشرقی بنگال کی 'علاقائی خودمختاری' مغربی پاکستان کے کئی مفاد پرستوں کے لیے بھی قابل قبول تھی کیونکہ یہ وہ ضروری قیمت تھی جس کی ادائیگی کی بنیاد پر وہ اپنے وسیع مفادات کو تحفظ فراہم کر سکتے تھے۔

ایک ایسے وقت میں جب فوج مشرقی بنگال میں پھنسی ہوئی تھی،عوامی لیگ کی قیادت کئی ہفتوں سے صدر یحیٰی خان اور ان کے سیاسی وفوجی مشیروں سمیت مغربی پاکستان کی سیاسی قیادت کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھی۔ان مذاکرات کا ایجنڈا مارشل لاء اور فوجی حکومت کے زیر اہتمام ہونے والے ملک کی تاریخ کے پہلے ہونے والے قومی انتخابات اور اس کے بعد پیدا ہونے والا دستوری بحران تھا۔عوامی لیگ جو زیادہ سے زیادہ علاقائی خودمختاری کا ایجنڈا لے کر انتخابی عمل میں شریک ہوئی تھی اس انتخاب میں بنگالیوں کی ١٦٩ نشستوں میں سے ١٦٧ نشستیں حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی۔جبکہ دوسری طرف پاکستان پیپلز پارٹی جس کی قیادت ذوالفقار علی بھٹو کر رہے تھے اور جنہیں فوج میں موجود کچھ انتہا پسند (hawk) کی مکمل تائید حاصل تھی وہ مغربی پاکستان کی ١٣١ میں سے ٨١ نشستیں حاصل کر سکی۔سب سے اہم بات یہ ہے کہ بھٹو کی سب سے شاندار کارکردگی مغربی پاکستان

کے صوبہ پنجاب میں رہی جو کہ ہمیشہ سے پاکستان پر حکمرانی کرتا آیا تھا۔ بھٹو کی جماعت اور فوج میں موجود انتہا پسند علاقائی خودمختاری کے سخت مخالف اور مضبوط مرکز کے حامی تھے۔ دونوں جماعتوں کے یہ متضاد موقف ایک دوسرے کے مخالف تھے۔

عوامی لیگ کو قومی اسمبلی میں مکمل اکثریت حاصل تھی۔ اس کو مغربی پاکستان کے کچھ پسماندہ (underprivileged) صوبوں خصوصاً بائیں بازو کی نیشنل عوامی پارٹی کی بھی مکمل حمایت حاصل تھی۔ عوامی لیگ کا مطالبہ تھا کہ قومی اسمبلی کا فوری اجلاس بلا کر اس کو کام کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ بھٹو نے مغربی پاکستان میں سب سے زیادہ نشستیں حاصل کرنے کی بنیاد پر اپنے آپ کو تمام مغربی پاکستان کا اصلی ترجمان سمجھتے ہوئے یہ اعلان کر دیا کہ دستور کی بنیادیں ان کی اور عوامی لیگ کے درمیان اجلاس سے قبل ہونے والے مذاکرات کی بنیاد پر رکھی جانی چاہئیں۔ بھٹو نے دھمکی دی کہ ان کی جماعت قومی اسمبلی کے ۳ مارچ کے بلائے جانے والے اجلاس کا بائیکاٹ کرے گی اور مغربی پاکستان میں ایک احتجاجی تحریک کا عندیہ دیا۔ صدر یحییٰ خان نے اسمبلی کے اجلاس کو ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا۔ شیخ مجیب نے یحیی خان کے اس قدم کے جواب میں مشرقی بنگال میں ہڑتال کا اعلان کر دیا جو کہ انتہائی کامیاب رہی۔ ہڑتال کے دوران فائرنگ کے نتیجے میں کئی ہلاکتیں بھی ہوئیں۔ صدر یحییٰ خان مشرقی بنگال کے دارالحکومت ڈھاکہ میں وارد ہوئے اور شیخ مجیب کے ساتھ مذاکرات کے کئی دور کیے۔ ان مذاکرات میں شیخ مجیب نے یحیی خان سے دوبارہ اپنے اس مطالبے کا اظہار کیا کہ فوج کو فوری طور پر بیرکوں (چھاؤنیوں) میں واپس بھیجا جائے۔ ۲۵ مارچ کو فوجی کاروائی کے آغاز سے قبل بھی ان تمام لوگوں کی طرف سے یہ حوصلہ افزا بیانات جاری ہوئے جس سے اس بات کا عندیہ ملتا تھا کہ معاملات سلجھنے کی طرف بڑھ رہے ہیں اور بات چیت کے مثبت نتائج سامنے آئیں گے۔ اس مرحلے پر فوجی کاروائی بالکل اچانک اور غیر امکانی (unexpected) تھی۔

عوامی لیگ نے مارچ کے ماہ کے آغاز میں جس ہڑتال کا بلاوا دیا تھا وہ مکمل طور پر کامیاب رہی۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ مذاکرات بھی جاری رہے۔مشرقی بنگال میں سول انتظامیہ اور پولیس کے عوامی لیگ کے ساتھ کھڑے ہوجانے کے نتیجے میں علاقے کا سارا انتظام بنگالیوں نے خود ہی سنبھال لیا۔اس صورتحال میں شیخ مجیب کے لیے ضروری ہوگیا کہ وہ اس 'عمومی ہڑتال' کو اس طرح منظّم کریں کہ لوگوں کو 'ضروری' کام کرنے اور ادائیگی فرائض کا موقع بھی میسر رہے۔اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے احکامات جاری کیے جن پر عمل درآمد کی ذمہ داری انتظامیہ کی تھی۔عوامی لیگ کے رہنماؤں نے اپنے آپ کو درحقیقت مشرقی بنگال کی حقیقی انتظامیہ کے طور پر پانا شروع کردیا۔یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے ریاست کی حقیقی قوت حاصل کرلی تھی۔شیخ مجیب ریاست کے تمام انتظام کے حقیقی نگران کے طور پر ابھر کر سامنے آئے تھے ماسوائے فوج کے۔

شیخ مجیب کے اس نئی صورتحال کے ابھر کر سامنے آنے کے باوجود مذاکراتی عمل میں شریک رہنے میں آمادگی نے بغیر کسی غلطی سے اس کے طرز سیاست اور اس کے اصل عزائم کو آشکار کردیا۔شواہد کی بنیاد پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ پاکستانی فوج اس مرحلے پر کسی بھی فوجی کاروائی کے لیے تیار نہ تھی کیونکہ اس کی بڑی تعداد اس وقت بھی مغربی پاکستان میں تھی۔اس مرحلہ پر اگر شیخ مجیب کی عوامی لیگ ایک آزاد ریاست 'بنگلہ دیش' کا اعلان کردیتی تو وہ اس میں باآسانی کامیاب ہوسکتی تھی اور اسقدر انسانی جانوں کا بھی نقصان نہ ہوتا جو کہ بعد میں ہوا۔لیکن وہ خود ایک ایسی آزادی کے حق میں نہ تھے جو کہ مقبول عوامی جدوجہد کے نتیجے میں حاصل ہوئی ہو۔انہوں نے تصادم کے بجائے مذاکرات اور مفاہمت کا راستہ اپنایا۔اس وقت جب کہ مذاکرات جاری تھے اس عرصے نے فوج کو یہ مہلت فراہم کی کہ وہ اپنے وسائل کو اکٹھا کر کے ایک بڑی فوجی کاروائی کے لیے خود کو تیار کرلے۔اس بات کا ایک واضح ثبوت فوج کی قیادت نے یکم مارچ کو اس وقت دیا جب ایک روشن خیال اور

ملنسار وائس ایڈمرل احسن کو مشرقی بنگال کے گورنر کے عہدے سے ہٹا کر ایک انتہا پسندوں کے انتہا پسند (Hawks of Hawks) یعنی جنرل ٹکا خان کو ان کی جگہ گورنر تعینات کر دیا۔ عوامی لیگ کے رہنما اس اہم تبدیلی کو کسی صورت نظر انداز نہیں کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اس کے باوجود مذاکرات جاری رکھے۔

پاکستان کا حکمران طبقہ شیخ مجیب کے تذبذب (dilemma) سے پوری طرح آگاہ تھا۔ انہیں اس بات کا اچھی طرح اندازہ تھا کہ مشرقی بنگال کے سماجی نظام میں عوامی لیگ وہ آخری حفاظتی بند (bulwork) تھی جس میں ان کے مفادات محفوظ تھے۔ انہوں نے اس بات کا احساس کر لیا کہ علاقائی خودمختاری کے حق کو تسلیم کرنے کی صورت میں انہیں اپنے کچھ مفادات کی قربانی دینا ہوگی۔ ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا نعم البدل بھی نہ تھا۔ انہیں اندازہ تھا کہ اگر صورتحال شیخ مجیب کے ہاتھوں سے بھی نکل گئی تو پھر اس کے نتیجے میں نچلی سطح سے انقلابی نکل آئیں گے اور پھر اس صورت میں ان کے ہاتھ کچھ بھی نہیں لگے گا۔ میں موجودہ صورت میں مختلف طبقات کے روّیوں کا ذکر بھی آگے چل کر کروں گا۔ لیکن یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ شیخ مجیب کا المیہ (dilemma) درحقیقت مغربی پاکستان کے حکمران طبقے کا بھی المیہ (dilemma) تھا۔

عوامی لیگ کا المیہ اس وجہ سے سامنے آیا کیونکہ اس کو ایک طرف فوج کا سامنا تھا تو دوسری طرف مقبول عوامی طاقتیں اس پر اپنا دباؤ ڈال رہی تھیں جبکہ مغربی پاکستان کی بورژوائی کا المیہ یہ تھا کہ ان کو دونوں صورتوں میں مشکل فیصلہ کرنا تھے اول یہ کہ اگر وہ علاقائی خودمختاری کے مقبول مطالبے کو تسلیم کرنے پر تیار ہو جاتے تو اس صورت میں ان کو اپنے کئی مفادات سے دستبردار ہونا پڑتا جبکہ دوسری صورت میں اگر وہ عوامی لیگ سے معاملات طے نہ کر لیتے تو پھر ان کو ان انقلابی قوتوں کا سامنا کرنا پڑتا جو کہ مشرقی بنگال میں پنپ رہی تھیں اور یہ سخت گیر قوتیں تحریک کو اپنے ہاتھ میں لے لیتیں۔ امریکی جنہوں نے اس

معاملے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا تھا وہ کسی پریشانی میں مبتلا نہ تھا سوائے چند پروٹوکول کی حائل مشکلات کے۔ انہوں نے عوامی لیگ کی حمایت اور حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اس میں اپنا اثر ونفوذ (infiltration) بھی کرلیا۔ اس کے جواب میں عوامی لیگ مکمل طور پر امریکہ نواز بن گئی اور اس نے اس مشکل وقت میں بھی امریکہ کی حمایت جاری رکھی جبکہ پاکستان میں امریکہ مخالف جذبات اپنے عروج پر تھے۔ اس طرح اس نے ہندوستان مخالف پروپیگنڈہ پر بھی دھیان نہ دیا جو کہ ہندوستان مخالف شاؤنسٹ مغربی پاکستانی سیاست دان کررہے تھے۔ ایک بات واضح ہونے لگی تھی کہ شیخ مجیب کی زیر قیادت بننے والی عوامی لیگ سرکار با آسانی امریکی اثر ونفوذ میں شامل ہوجائے گی۔

اس صورتحال میں ہندوستان کا طریقہ مداخلت انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ ابتدائی طور پر یہ مداخلت سفارتی اور پروپیگنڈہ کی حد تک محدود تھی۔ مثلاً وہ لوگ جو مشرقی بنگال سے فرار ہوکر ہندوستان میں پناہ لے کر وہاں بنگلہ دیش کی عبوری حکومت کا اعلان کر چکے تھے انہیں مدد فراہم کی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ انڈین پریس اور ریڈیو نے مشرقی بنگال میں پاکستان کی کاروائی کو بڑے ظالمانہ قرار دیتے ہوئے اس کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا شروع کردیا۔ اس انڈین پروپیگنڈہ سے بنگلہ دیش کے مقصد (cause) کو فائدہ پہنچنے کے بجائے مزید نقصان ہوا۔ پاکستانی فوج کو مغربی پاکستان میں یہ بات بارآور کرنے میں مزید آسانی فراہم ہوگئی کہ مشرقی بنگال میں ہندوستان اپنے ایجنٹوں کے ذریعے بے چینی پیدا کررہا ہے اور مشرقی بنگال میں جاری تحریک کو ہندوستان کی ہر قسم کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ لیکن اب تک ہندوستان کی طرف سے کسی براہ راست فوجی مداخلت کے کوئی ثبوت مہیا نہ تھے۔ صرف پاکستان اور ہندوستانی فوجوں کے درمیان سرحدوں پر کچھ جھڑپوں کے چند واقعات رونما ہوتے رہے۔ جو کہ آنے والے دنوں میں مزید بڑھ سکتے تھے۔ لیکن اس وقت تک ہندوستان کی مسلح افواج نے بڑی حد تک صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا ہوا تھا اور اس تحریر

کے رقم کیے جانے تک ہندوستان نے بنگلہ دیش کی آزادی کے لیے لڑنے والی قوتوں کو حقیقی فوجی کاروائی کرنے اور مادی (material) امداد پہنچنے میں اتنی زیادہ دلچسپی اور تیزی نہیں دکھائی یا پھر نسبتاً کافی کم تھی۔ ہندوستان کی حکومت اپنے اتنے قریب میں جو کہ اس کے مغربی بنگال کے صوبے سے منسلک تھا وہاں اتنی بڑی انقلابی تحریک زیادہ عرصے تک برداشت کرنے کی پوزیشن میں نہ تھی۔ کیونکہ مغربی بنگال بذات خود بے چینی (turmoil) میں مبتلا تھا۔ ہندوستان کی منصوبہ بندی (strategy) یہ تھی کہ کسی بھی طرح مشرقی بنگال کے دارالحکومت ڈھاکہ، میں عوامی لیگ کی حکومت قائم کروادی جائے اور بین الاقوامی دباؤ ڈال کر پاکستانی فوج کی واپسی کروائی جائے۔ مزید یہ کہ مغربی دباؤ کے زیر اثر بننے والی بنگال کی نئی حکومت سے ہندوستان اچھے تعلقات قائم کرسکتا تھا اور مستقبل میں بہتر تعاون کی امید بھی برقرار تھی۔

امریکہ اور ہندوستان کی مدد سے عوامی لیگ کی زیر قیادت بنگلہ دیش کی آزاد حکومت کے قیام کے امکانات سے چین کو شدید خدشات اور پریشانی لاحق تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مشرقی بنگال کی جغرافیائی حیثیت انتہائی حساس علاقے میں واقع تھی۔ نہ صرف اضطرابی مغربی بنگال کا ہی پڑوسی نہ تھا بلکہ اس کی سرحدیں برما (میانمار) اور خود چین کی سرحدوں سے بھی زیادہ دور نہ تھیں۔ ہندوستان، سوویت یونین اور دیگر مغربی قوتوں سے اس مسئلے پر ہونے والے تصادم کی صورت میں چین پاکستان کے ساتھ اپنے تعلقات میں مزید گرم جوشی کا مظاہرہ کرنے لگا۔ پاکستانی حکمرانوں کو اپنی مکمل مدد کا عندیہ دیتے ہوئے چینی لیڈر چوین لائی نے صدر یحییٰ خان کو ایک مراسلے میں لکھا کہ ''وہ حکومت پاکستان اور پاکستانی فوج کی طرف سے جاری کاروائی کی حمایت کرتے ہیں اور چینی 'پاکستان کی سیاسی قیادت کے مختلف حصوں (quarters) کی طرف سے ملک کو یکجا رکھنے کے لیے اٹھائے گئے اقدامات اور اسے مزید بکھیرنے سے بچانے کے لیے جاری کوششوں کی مکمل حمایت کرتا ہے۔ چین نے

'پاکستان کے اندرونی معاملات میں کسی بھی صورت کی بیرونی مداخلت' کی صورت میں شدید ردعمل کی دھمکی دیتے ہوئے انڈیا کے توسیعی عزائم کو بھی بھرپور قوت سے روکنے کا اشارہ دیا۔ چین کی طرف سے اس قسم کے بیانات کو مغربی پاکستان کی سرکاری کنٹرول پریس نے بڑے نمایاں طور پر شائع کیا جس کا مقصد عوامی سطح پر صورتحال کو الجھن (confusion) کا شکار کرنا تھا اور اس کا ایک اور مقصد ان لوگوں کے حوصلے بلند کرنا تھا جو کہ ایک وسیع علاقے کے تمام لوگوں کے خلاف تاریخ کے بدترین جرائم کے مرتکب ہو رہے تھے۔

بنگلہ دیش کی آزادی کے لیے شروع کی گئی مسلح جدوجہد میں بائیں بازو کا ماؤئسٹ ہر اوّل دستے کا کردار ادا کر رہا ہے۔ یہ نہ صرف دیگر بائیں بازو کے دھڑوں کے ساتھ مل کر مزاحمتی تحریک میں شریک ہے بلکہ وہ عوامی تحریک کے شدت پسند گروپ (militant cadre) کو بھی اپنے ساتھ شامل کر کے انہیں اس جدوجہد میں شریک کر چکا ہے۔ ان کے ساتھ عوامی لیگ کے وہ لوگ بھی اس لڑائی میں شریک ہیں جنہوں نے ہندوستان میں پناہ لینے کے بجائے اس لڑائی میں شریک ہونے کو ترجیح دی ہے۔ چین کی حکومت نے مشرقی بنگال کے اس بحران کو نہایت سادگی سے صرف مغربی سازشوں اور عوامی لیگ کی قیادت کے ہندوستان کے اثر و نفوذ کے نقطہ نظر سے دیکھا اور بڑی حد تک آزادی کی اس تحریک میں لڑنے والے آزادی پسند گروہ کے سیاسی کردار پر غور و خوض نہیں کیا جس کے باعث وہ سیاسی طور پر مکمل طور پر تنہا رہ گیا۔ یہ پالیسی اپناتے ہوئے چین نے بین الاقوامی پرولتاریہ کی ذمہ داریوں (obligations) سے بھی انکار کر دیا۔ چین نے یہ سب کچھ کرتے ہوئے اپنی کوتاہ بینی اور بنگلہ دیش میں ابھر کر سامنے آتی ہوئی حقیقی سماجی قوتوں کی ترقی کو سمجھنے میں اپنی ناکامی دکھائی اور یہ ظاہر ہوا کہ وہ صورتحال کا مکمل طور پر ادراک ہی نہیں کر سکا۔ چین عوامی لیگ کی قیادت اور بنگلہ دیش کے غصے میں بپھرے ہوئے (resurgent) عوام کے باہمی تعلق سے بھی بے خبر رہا۔ عوامی لیگ کی قیادت کو انتخابات میں مکمل کامیابی بھی اسی

ابھرتی ہوئی بنگالی قوم پرستی کے جذبات کے باعث ہی حاصل ہوئی اور سب کو یہ معلوم تھا کہ ان جذبات میں فوری کمی کے کوئی اثرات نہیں۔عوامی لیگ اپنی مجبوریوں (limitatios) اور مغربی طاقتوں پر بے حد انحصار کے باوجود اس کی قیادت کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہ تھا کہ مقبول قوتوں کو مطمئن رکھیں اور اس کی وجہ سے عوامی لیگ کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا۔وہ مقبول مطالبات پر اور زیادہ زور دیتی چلی گئی۔مستقبل کی بنگلہ دیش کی حکومت کی سمت کا تعین صرف عوامی لیگ تنہا نہیں کرے گی بلکہ آزادی کی جدوجہد میں شریک دیگر قوتیں بھی برابری کی حصہ دار ہوں گی۔اس مرحلے پر چین کے موقف (Stand) کے باعث الجھن اور (confusion) پھیلے گئی اور انقلابی اتحاد میں دراڑیں بھی دیکھنے کو مل رہی ہیں۔عوامی لیگ میں وہ عناصر جو کہ عوامی قوتوں کو کمزور کر کے دائیں بازو کے عناصر کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں وہ چین کی طرف سے اٹھائے گئے موقف کا بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں۔لیکن خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ مشرقی بنگال کی ماوئسٹ قیادت نے اپنے آپ کو آزادی کی جدوجہد میں مصروف قوتوں سے خود کو علیحدہ نہیں ہونے دیا۔انہیں یقین ہے کہ چین کو اپنی غلطی کا اعتراف جلد ہوگا اور پھر وہ اس کی تلافی کے لیے اقدامات بھی کرے گا۔

مغربی طاقتوں اور انڈیا کے حکمران طبقوں کی منصوبہ بندی (strategy) یہ ہے کہ بات چیت کے ذریعے اور باعزت طریقے سے مشرقی بنگال سے پاکستانی افواج کی واپسی کرائی جائے اور وہاں عوامی لیگ کی قیادت میں حکومت قائم کرائی جائے۔مغربی قوتیں پاکستان پر دباؤ ڈالنے کے لیے بڑی مضبوط پوزیشن میں ہیں۔پاکستان کے چین سے انتہائی قریبی تعلقات کے باوجود وہ بڑی حد تک امداد اور مالی مدد کے لیے مغرب پر انحصار کرتا ہے۔پاکستان اور چین کے اتحاد میں اب تک مغرب کے دباؤ کے باوجود کوئی کمی دیکھنے کو نہیں آئی اور پاکستان کا حکمران طبقہ انڈیا کی موجودہ حکمت عملی کو دیکھتے ہوئے اس اتحاد کو مزید 'اہمیت' دینے لگا ہے۔مغربی پاکستان میں چین کے لیے زیادہ اور تیزی سے

بڑھتی ہوئی خیر سگالی کے باوجود یہ اتحاد انتہائی کمزور ہے۔ چین اور پاکستان کے اس اتحاد کے کمزور ہونے کی سب سے بڑی بنیاد پاکستان کا مغربی ممالک کی طرف سے دی جانے والی امداد پر انحصار ہے جو کہ زیادہ تر امریکہ سے آتی ہے جبکہ اس کے ساتھ دوسری اہم بات پاکستانی بورژواری (زیادہ تر مغربی پاکستانی) اور بیرونی سرمائے کے درمیان بڑھتا ہوا تعاون ہے۔

پاکستان گذشتہ کچھ عرصے سے اقتصادی مسائل میں گھرا ہوا ہے اور یہ خراب معاشی صورتحال آہستہ آہستہ مزید بدتر ہوتی جارہی ہے۔ اب مشرقی بنگال میں فوجی کاروائی اور مشرقی بنگال کی اقتصادی صورتحال کے تباہ ہونے کے ساتھ یہ صورتحال پاکستان کے لیے ناقابل برداشت ہوتی جارہی ہے۔ اس کی وجہ سے پاکستان نے بیرون ممالک سے حاصل شدہ قرضوں کی واپسی میں چھ ماہ کی مہلت طلب کی ہے۔ بیرونی ادائیگیوں کی یہ رقم ۶۰ ملین پاؤنڈ سالانہ بنتی ہے جو کہ پاکستان کی کل برآمدات کا ۲۰ فیصد ہے۔ پاکستان کی اقتصادیات بڑی حد تک درآمدات پر انحصار کرتی ہے اور اس کے لیے بھی پاکستان کو اچھی خاصی رقم کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ روایتی طور پر پاکستان کی درآمدات اس کی برآمدات سے کہیں زیادہ رہی ہے اور مجموعی طور پر یہ صورتحال بتاتی ہے کہ پاکستان کے اخراجات اس کی آمدنی سے زائد ہیں۔ اس کمی (deficit) کو پورا کرنے کے لیے بیرونی ذرائع سے مزید قرضے حاصل کیے جاتے ہیں۔ گذشتہ سال مغربی ممالک کے امدادی گروپ Aid Consortium نے امریکہ کی سربراہی میں پاکستان کو ۳۸۰ ملین ڈالر کی جامد امداد (stand still aid) کے تحت فراہم کیے۔ یہ امداد پاکستان کی برآمدات سے حاصل ہونے والی آمدنی کا تقریباً نصف بنتا ہے۔ مغربی امداد پر پاکستان کے اس طرح بھاری پیمانے پر انحصار کے باعث پاکستان کی حیثیت (position) انتہائی کمزور ہوگئی ہے۔ چین پاکستان کو اس اقتصادی بحران سے باہر نہیں نکال سکتا حالانکہ اس نے پاکستان کو ۸۸ ملین پاؤنڈ سود سے پاک قرضہ

فراہم کیا ہے۔اس لیے صدر پاکستان کے ایک خصوصی ایلچی امداد کا کشکول لے کر مغربی ممالک کے دورے بھی کر رہے ہیں۔لیکن پریس کے ذریعے سامنے آنے والی رپورٹوں سے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ ان گشتی سفیروں کو مغربی ممالک کی جانب سے سرد مہری کا سامنا کرنا پڑا۔حکومت پاکستان پر اس بڑھتے ہوئے اقتصادی دباؤ میں مغربی طاقتوں کا بھرپور کردار ہے۔ دوسری طرف صدر یحیٰی خان اور پاکستانی حکام نے مصالحتی زبان میں بات کرنا شروع کردی ہے۔لیکن اب بات اس مرحلے سے بہت آگے چلی گئی ہے جہاں پر کہ اس بات چیت کا سلسلہ منقطع ہوا تھا اور ان کی بحالی بہت مشکل ہوگئی ہے۔حالیہ بدترین خون خرابے نے دونوں طرف صورتحال کو اس نہج پر پہنچادیا ہے کہ اب (hostility) کے جذبات سے نکل کر باہر آنا تقریباً ناممکن ہے۔

مشرقی بنگال میں ہونے والے holocaust نے مشرقی بنگال کے لوگوں کے ذہنوں پر فوج اور حکمران جو کہ اس کی مدد سے حکمرانی کرتے ہیں ان کے خلاف انتہائی نفرت پیدا کردی ہے۔حکمرانوں نے کوششیں کیں ہیں کہ اپنے لیے مشرقی بنگال میں دوبارہ سیاسی بنیادیں پیدا کرلیں۔لیکن صورتحال اس قدر خراب ہے کہ مغربی پاکستان کا ساتھ دینے والے (collaboraters) بھی اب اس حالت میں نہیں کہ وہ فوج کی مدد سے اپنا وجود غیر متعینہ مدت تک برقرار رکھ سکیں۔خاص طور پر اس مرحلے پر جب مزاحمتی قوتوں کو دوبارہ یکجا کرنے کی کوششیں جاری ہیں (ابتدائی طور پر فوج کے ہاتھوں زبردست نقصان اٹھانے کے باوجود) اور خاص طور پر عوامی سطح پر اس مزاحمت کے لیے بڑھتی ہوئی مقبولیت کے بعد۔ مزید یہ کہ نہ ہی مغربی طاقتیں اس بات کی اجازت دیں گی کہ صورتحال مزید زیادہ عرصہ تک اسی طرح برقرار رہے۔ان کے خیال میں اس صورتحال کا بہترین حل یہ ہے کہ پاکستان کی افواج کی واپسی ہو اور آزاد بنگلہ دیش میں شیخ مجیب کی سربراہی میں عوامی لیگ کی حکومت قائم کی جائے۔ یہ صورتحال باآسانی حاصل نہیں کی جاسکتی۔

مغربی طاقتوں کے پاس پاکستان پر دباؤ ڈالنے کا سب سے موثر ہتھیار اقتصادی دباؤ ڈالنے کا ہے جو کہ وہ پہلے ہی پاکستان پر ڈال رہے ہیں۔اس دباؤ کے نتیجے میں پاکستان جو کہ پہلے ہی مالی بحران کا شکار ہے مزید دباؤ میں آ سکتا ہے۔لیکن مغربی طاقتیں یہ دباؤ آہستہ آہستہ اور بڑے احتیاط سے ڈال رہی ہیں۔کیونکہ ان کے بہت سے مفادادت کو خطرہ ہے۔خاص طور پر مغربی پاکستان میں جہاں مکمل اور اچانک مالیاتی تباہی(collapse) بڑی تباہی لاسکتا ہے۔ان کا خیال ہے کہ اس صورتحال کے پیدا ہونے سے مغربی پاکستان کا سماجی نظام (social order) بکھر سکتا ہے۔ اور ایسے حالات میں ایسی قوتیں مغربی پاکستان میں سامنے آ سکتی ہیں جو کہ مغرب کے مفادات کے لیے مشکلات پیدا کرسکتی ہیں۔ ان کی کوششوں سے لگتا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ پاکستان میں نوکرشاہی اور فوجی اتحاد سے بنی ہوئی حکومت کی ترتیب اور سیاسی جماعتوں اور ان کی سیاسی قیادت میں ہم آہنگی لائی جائے۔ یہ کام مختلف حیلوں اور طریقوں سے دباؤ ڈال کر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے انہیں کچھ چہروں کو اقتدار سے الگ کرنا ہوگا۔لیکن وہ لوگ جو ان مغربی طاقتوں کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے رضا مند ہو جائیں انہیں کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔مشرقی بنگال سے بین الاقوامی اقتصادی دباؤ کے نتیجے میں فوج کی زبردستی واپسی نہ صرف فوج میں موجود چند انتہا پسندوں(hawks) کے لیے بہت بڑا صدمہ ہوگا بلکہ عام فوجیوں کے لیے تکلیف دہ بات ہوگی اور اس کے علاوہ سب سے بڑی بات یہ کہ مغربی پاکستان کے عوام کے ایک بڑے حصے کے لیے بھی یہ حیرت کی بات ہوگی کیونکہ شاونسٹ پروپیگنڈہ کے تحت انہیں اب تک یہ بتایا گیا ہے کہ مشرقی پاکستان میں جاری اس تحریک کی اپنی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ انڈیا کی حمایت سے چلائی جارہی ہے۔کیونکہ انڈیا ایک سازش کے تحت پاکستان کے ٹکڑے کرنا چاہتا ہے۔اس بات کے کچھ اشارے موجود ہیں کہ مغربی طاقتوں کی کاوشیں اب رنگ لارہی ہیں۔فوج کے انتہا پسندوں

(hawks) کو بھٹو (جنہوں نے مغربی پاکستان میں واضح اکثریت حاصل کر رکھی ہے) کی مکمل حمایت حاصل ہے۔لیکن اب پی پی پی کے اندر تقسیم اور اندرونی دھڑے بندی اور جھگڑے شروع ہو گئے ہیں۔بھٹو نے خود حالیہ دنوں میں کچھ ایسے بیانات دیئے ہیں جو کہ بڑی ہی اہمیت کے حامل ہیں۔اس نے قبل ازیں خود خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ فوجی کارروائی کے نتیجے میں پاکستان کو بچانا ممکن ہوا۔اب اس نے خود بنگالیوں کے استحصال کے الزامات پر ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے چین کی طرف بہت زیادہ جھکاؤ سے بھی اپنے آپ کو دور کیا ہے۔بھٹو کے ان بیانات سے لگتا ہے کہ وہ اب اس بات کے لیے آمادہ ہے کہ وہ مغربی طاقتوں کے اپنی ذات سے متعلق خدشات کو دور کرنے کے لیے تیار ہے۔اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو گیا تو یقیناً وہ مغربی طاقتوں کے لیے بہت بڑا اثاثہ بن جائے گا۔لیکن اس صورتحال میں کئی غیر یقینیاں حائل ہیں۔کوئی یقین سے یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ آنے والے دنوں میں خود بھٹو یا پھر اس کی جماعت کے ساتھ کیا ہوگا اور مزید یہ کہ دیگر مختلف لوگ آنے والے دنوں میں اس کھیل میں کیا کردار ادا کریں گے جو کہ آگے جا کر یہاں کھیلا جائے گا۔ لیکن ایک بات واضح ہے کہ مغربی پاکستان میں سیاست اور طاقت کے توازن میں مغربی طاقتوں کو) جوڑ توڑ manipulation کرنا پڑے گی اس سے قبل کہ وہ اپنے منصوبوں پر مکمل عمل درآمد کرا سکیں۔

مغربی طاقتوں کو مشرقی بنگال میں بھی اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔مشرقی بنگال میں اس وقت عوامی آزادی کی لڑائی جاری ہے۔اور اس دوران وہاں نئی قوتیں سامنے آ چکی ہیں۔عوامی لیگ واحد نقطہ نظر (monolithic) رکھنے والی جماعت نہیں اور نہ ہی اس کا تنظیمی ڈھانچہ بھی کوئی بہت زیادہ مستحکم ہے۔اس کے برعکس اس کے کام کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ ایک قیادت کے گرد اکٹھا ہو جاتی ہے جس کو عوام میں بڑی پذیرائی حاصل ہے۔جس برق رفتاری سے عوامی لیگ نے مشرقی بنگال میں اپنا اثر قائم

کر کے انتخابات میں شاندار کامیابی حاصل کی ہے یہ اس تیز رفتاری سے ختم بھی ہوسکتی ہے۔ اگر اس کی قیادت عوام کی امنگوں اور خواہشات پر پوری نہ اتر سکی یا پھر اپنے آپ کو ان لوگوں سے خود کو الگ کر کے کھڑا کر لیا کہ جنہوں نے مشرقی بنگال کی آزادی میں حقیقی کردار ادا کیا۔ عوامی لیگ کے اندر بھی ایسے لوگوں کی کافی بڑی تعداد ہے جو کہ یہ چاہتے ہیں کہ عوامی لیگ کو مغربی طاقتوں کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنے لوگوں پر انحصار کرنا چاہیے۔ اس سے زیادہ یہ کہ عوامی لیگ کے لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ اقتدار میں رہے اور اپنے لوگوں پر بھروسہ نہ کرے۔ کیونکہ مشرقی بنگال میں روایتی حکومت کا وہ ڈھانچہ نہیں کہ جن کے بل بوتے پر حکومتیں اپنے ظالمانہ ہتکھنڈے (repressive) استعمال کر کے مخالفین کی آوازیں دبا سکے۔ حقیقی معنوں میں مشرقی بنگال کی کوئی فوج ہی نہیں (ہر طرف سے انڈیا کے گھیراؤ میں آئے ہو صرف ایک بڑی چھوٹی پٹی کے ذریعے سے برما سے منسلک ہونے کے باعث مشرقی بنگال کی ایک رجعت پسند حکومت یہ یقین کر سکتی ہے کہ اس کی مختصر سی فوج کو اندرون ملک مقبول عوامی طاقتوں کو کنٹرول کرنے کے لے بڑی مشکل ہوگی چہ جائیکہ وہ بیرونی خطرات کا مقابلہ کر سکے) مزید کہ مغربی پاکستان کی فوج نے کاروائی کے دوران پولیس کے نظام کو بھی تقریباً ختم کر کے رکھ دیا۔ کئی سینئر اور تجربہ کار پولیس افسران کو دوران کاروائی ہلاک کر دیا گیا۔ اس صورتحال میں مشرقی بنگال میں کسی بھی قسم کی مقبول عوامی تحریک کے ابھر کر سامنے آنے کی صورت میں عوامی لیگ اور اس کی قیادت کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے اور یہی مشکل مغربی طاقتوں کو بھی پیش آ سکتی ہے۔ اس صورتحال میں انہیں پسند (choices) کرنا پڑیں گی۔ اور بنگلہ دیش کا مستقبل بھی ان انتخاب (choices) سے وابستہ (determined) ہوگا جس کا فیصلہ یہ قوتیں مختلف مشکل مراحل (critical juncture) پر یہ خود کریں گی اور دوسری بات وہ تعلق اور رشتہ ہوگا جو کہ قوتیں ان قوتوں کے ساتھ استوار کریں گی جو کہ مغربی اس ملک کی آزادی کی مقبول مزاحمتی تحریک کا حصہ

ہیں۔

مشرقی بنگال کے مسئلے کے ساتھ ساتھ ایک اور اہم مسئلہ بھی ہے جس نے کہ پورے پاکستان کو متاثر (prevade) کر رکھا ہے۔ موجودہ مسئلے کا حل صرف ایک آزاد بنگلہ دیش کے اعلان کے ساتھ اختتام پذیر نہیں ہوگا۔ علاقائی خودمختاری کا مسئلہ پورے مغربی پاکستان کا بھی مسئلہ ہے کیونکہ اپنے ابتداء سے ہی پاکستان ایک ایسی قوم بن گئی ہے جو کہ اپنی شناخت کی تلاش میں ہے۔ اس ملک کے وجود کے لیے ہونے والی جدوجہد لڑی جانے والی دوقومی نظریے کی بنیاد پر لڑی گئی ہے جس کا سب سے زیادہ پروپیگنڈہ مسلم لیگ نے کیا تھا۔ اس نظریے کے تحت انڈیا کے مسلمان ایک جدا قوم تھے، دیگر ہندوستانیوں سے جو کہ ہندو تھے۔ حیرت انگیز بات ہے کہ اس نظریے کا انکار اسی دن کر دیا گیا جس دن اس ملک کا قیام ہوا اور یہ انکار کرنے والا بھی اس ملک کا بانی قائداعظم محمد علی جناح تھا۔ دستور ساز اسمبلی سے اپنے اختتامی خطاب میں ہی ان کا کہنا تھا کہ پاکستان کے تمام شہری بغیر کسی تفریق کے اس ملک کے مساوی شہری ہیں اور ایک قوم کا حصہ ہیں۔ یہ واضح طور پر ایک سیکولر تصور قومیت تھا۔ جس کا پیغام وہ دے رہے تھے۔ پاکستان ایک کٹر مذہبی (theocratic) ریاست نہیں بننے جا رہی تھی۔ انہوں نے اعلان کیا ''وقت گزرنے کے ساتھ ہندو نہ ہندو رہیں گے نہ مسلمان مسلمان رہیں گے۔ مذہبی معنوں میں نہیں.....لیکن سیاسی مفہوم میں، اس ریاست کے شہری کے طور پر''۔

آزادی کے بعد 'اسلامی اتحاد' کے نعرے نے پاکستانی معاشرے اور سیاست میں ایک نئی اہمیت حاصل کر لی۔ اس نعرے کو ایک طرف سے تو مذہبی جماعتوں کی حمایت حاصل ہوگئی تو دوسری طرف سے نوکر شاہی اور فوج کے مشترکہ ٹولے (oligarchy) سے، کیونکہ وہ کسی بھی علاقائی قومیت کے تصور کو تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ اسلامی اخوت کے نعرے کو حکمران گروہوں نے اس لیے گھڑا تھا کہ اس کو بنیاد بنا کر علاقائی اکائیوں کی نہ صرف

شناخت سے انکار کیا جائے بلکہ ان کی طرف اپنے جائز مطالبات اور اقتصادی ضروریات کے لیے اٹھائی جانے والی آوازوں کو بھی دبایا جائے۔ اسلامی نظریے پر زور ڈالنے اور حکمران ٹولے کی طرف سے پسماندہ گروہوں کے مطالبات کو تسلیم نہ کرنے ہی نے دراصل اس ملک کی یکجہتی کو زبردست نقصان پہنچایا اور ملک کے مختلف علاقائی گروہوں کے ان خدشات کو مزید تقویت حاصل ہوئی کہ اس ملک میں ان کے حقوق اور ضروریات کو کبھی تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ اسلامی نظریہ جس کو حکمران طبقہ استحصال کے لیے استعمال کر رہا تھا، وہی نظریہ اس ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا باعث بن رہا تھا۔

کسی ایک علاقے کے 'مفاد' کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی دوسرے علاقے کو نظرانداز کرنا، علاقائی بنیادوں پر پسماندگی (disparities) پر طویل بحث و مباحثے ان قوتوں کو پنپنے میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں جو کہ خود اس کے تخلیق کار ہوتے ہیں مثلاً 'سرمایہ دارانہ طریقۂ پیداوار (Capital Mode of Production) اور اقتصادی ناہمواری (unevenness) جو کہ سرمایہ دارانہ طریقہ ترقی میں سرایت کیا ہوا ہے۔ ایسی ترقی نہ صرف مختلف سماجی طبقوں بلکہ مختلف علاقوں کے درمیان بھی مختلف سماجی ڈھانچوں کی بنیاد پر تناؤ (polarization) پیدا کرتی ہے۔ سرمایہ دارانہ ترقی کا یہ بین الاقوامی سطح پر تسلیم شدہ اصول ہے کہ یہ صرف نوآبادیاتی معاشروں جیسے کہ پاکستان تک محدود نہیں۔ اس طریقہ پیداوار میں تبدیلی کیے بغیر کسی بھی علاقے میں شامل کی گئی کسی حد کی بھی خودمختاری کسی بھی مسئلے کا حل پیش نہیں کرتی۔ علاقائی خودمختاری کے لیے چلائی جانے والی تحریکوں پر بغیر تنقید کیے صرف اس غلط مفروضے کی بنیاد پر حمایت کرنا کہ اس خودمختاری کا مطالبہ کرنے والے بورژوا جمہوری درجہ (stage) ہیں جو کہ سوشلسٹ انقلاب سے قبل کا درجہ ہے۔ یہ نقطہ نظر اس بحث کو پس پشت ڈال دیتا ہے کہ جو کہ مختلف علاقوں کے سماجی ڈھانچہ میں سماجی ناہمواریوں کا سبب بنتا ہے اس لیے یہ سراب (illusion) جنم لیتا ہے کہ علاقائی مسئلے کا

حل سوشلسٹ انقلاب سے قبل تلاش کرنا چاہیے اور یہ کہ یہ مسئلہ سوشلسٹ انقلاب لائے بغیر بھی حل کیا جاسکتا ہے۔ یہ تصور سوشلسٹ تحریک کو چلانے والی قوتوں کو تقسیم کرنے اور مختلف سمتوں میں بانٹ کر رکھ دیتا ہے۔

سوشلزم کے حصول کے لیے متحدہ جدوجہد کے اصول پر سختی سے زور دینے پر جو کہ علاقائی ناہمواری کے خاتمے کے لیے ایک ضروری شرط ہے، یہ غلط نتیجہ اخذ نہیں کر لینا چاہیے کہ میں بنگلہ دیش کی آزادی کے لیے جاری جدوجہد کے لیے اپنی کھلی مدد کا اعلان کر رہا ہوں۔ مشرقی بنگال کی آزادی اب ایک تاریخی ضرورت بن گئی ہے۔ اس لیے نہیں کہ یہ جدوجہد خود ہی علاقائی ناہمواری کا مسئلہ حل کر لے گی اور نہ ہی اس لیے کہ یہ تحریک ایسے علاقے میں چل رہی ہے جن کی ثقافتی شناخت پاکستان کے دیگر علاقوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہ اس لیے تاریخی ضرورت بن گئی ہے کیونکہ پاکستانی فوج کی خونی کاروائی نے اس علاقے میں نئی سیاسی صورتحال کو جنم دیا ہے۔ اس کاروائی نے مشرقی بنگال اور مغربی پاکستان میں موجود پہلے کے رابطوں کو بھی ختم کر دیا ہے اور بنگالی قوم کا تصور مزید اور واضح شکل میں ابھر کر سامنے آ گیا ہے۔ اس کاروائی نے قومی آزادی کی قوتوں کو بھی متحرک کر دیا ہے جو کہ اس بات کی اجازت نہیں دیں گی کہ بنگلہ دیش میں سوشلسٹ جدوجہد کو عوامی لیگ کی دائیں بازو کی کمزور پیٹی بورژوا قیادت کے ذریعے روکا جا سکے۔ جبکہ دوسری طرف مغربی پاکستان، پر اس تجزیے کے اثرات (implcation) (جو کہ خود امیر و غریب علاقوں میں تقسیم ہے، اور ہر علاقے کی جداگانہ ثقافتی شناخت ہے) بالکل مختلف چیز ہے۔ بنگلہ دیش کی آزادی مغربی پاکستان کے مختلف علاقوں کے درمیان موجود باہمی علاقائی مسائل کو مزید واضح (sharp) کر دے گا اور ان قوتوں کی حوصلہ افزائی کرے گا جو کہ علیحدگی کے خواہش مند ہیں لیکن مغربی پاکستان کی مزید تقسیم (balkanization) سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اس لیے سب سے بہتر حل مغربی پاکستان میں سوشلسٹ تحریک چلانے میں ہے۔

میں یہاں چند اعداد و شمار دوں گا جس سے کہ مختلف علاقوں کے درمیان پائی جانے والی بین العلاقائی تفریق (disparities) کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکے۔ ان اعداد و شمار سے یہ بات معلوم ہوگی کہ صرف مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان اس قسم کی تفریق نہیں پائی جاتی بلکہ خود مغربی پاکستان کے اندر بھی علاقائی بنیادوں پر یہ تفریق موجود ہے۔ میں ہاورڈ یونیورسٹی کے پروفیسروں کے ایک بیان سے (۳) جو کہ حالیہ دنوں میں جاری ہونے والی سرکاری دستاویز 'چوتھے پنج سالہ منصوبے پر مشاورتی رپورٹ' (Reports of Advisory Plans for the Fourth Five Year Plan) کے نام سے منصوبہ بندی کمیشن (Planning Commission) نے جاری کی ہے۔ منصوبہ بندی کمیشن ایک ایسا ادارہ ہے کہ جس پر مشرقی بنگال کے لیے تعصبی رویے رکھنے کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ ان پروفیسروں کے مطابق ۶۰۔۱۹۵۶ء (پہلے پنج سالہ منصوبے) کے عرصے کے دوران مغربی پاکستان کی فی کس آمدنی مشرقی بنگال سے ۳۲ فیصد زائد تھی۔ اس کے تقریباً ڈیڑھ ڈھائی برس بعد تیسرے پنج سالہ منصوبے کے ۷۰۔۱۹۶۵ء کے وقت یہ تفریق مزید بڑھ کر ۶۱ فیصد ہوگئی تھی۔ ہاورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر سرکاری اعداد و شمار کی بنیاد پر بتاتے ہیں کہ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی بنیاد پر مشرقی بنگال کی آبادی جو کہ پاکستان کی کل آبادی کا ۵۴ فیصد تھی لیکن حکومت پاکستان نے مشرقی بنگال کے لیے ۵۵۔۱۹۵۰ء کے ترقیاتی بجٹ کا صرف ۲۰ فیصد مختص کیا۔ ۷۰۔۱۹۶۵ء کے عرصے کے دوران تیسرے پنج سالہ منصوبہ میں مشرقی بنگال کو سب سے زیادہ حصہ دیا گیا لیکن وہ بھی ۳۶ فیصد سے زیادہ نہ ہو سکا تھا۔ ان ہی اعداد و شمار کی بنیاد پر یہ پروفیسر بتاتے ہیں کہ گذشتہ دو دھائیوں کے عرصے میں پورے پاکستان کی برآمدات میں مشرقی پاکستان کا حصہ ۵۰ سے ۷۰ فیصد رہا۔ جبکہ پاکستان کی کل درآمدات میں سے صرف ۲۵ تا ۳۰ فیصد مشرقی بنگال کے لیے تھا۔ یہ مسابقی اعداد و شمار مغربی پاکستان کے دیگر علاقوں کے بارے میں میسر نہ آ سکے۔

اس سلسلے میں موجود کچھ دیگر اعداد و شمار سے اس تفریق کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً مغربی پاکستان کی سب سے بڑی فصل گندم ہے جو کہ کل قابل کاشت اراضی کا تقریباً تین چوتھائی تھا۔ پہلے ۱۹۶۴ء میں پنجاب نے پاکستان میں کاشت ہونے والی کل گندم کا ۷۸ فیصد پیدا کیا اور اس کا حصہ اس وقت سے مسلسل بڑھتا ہی گیا ہے۔ جبکہ مغربی پاکستان کی کل آبادی کا صرف ۵۰ فیصد یہاں رہتا ہے۔ اسی طرح کپاس مغربی پاکستان کی ایک اور اہم فصل ہے۔ پنجاب اس کا ۶۸ فیصد پیدا کرتا ہے جبکہ تیسری اہم فصل چاول ہے۔ اس کے لیے مختص کی گئی زمین گندم کے لیے مختص کی گئی زمین کے صرف چوتھائی کے برابر تھی۔ لیکن اس کے باوجود پنجاب نے چاول کا ۵۰ فیصد پیدا کیا۔ اس طرح پنجاب نے گنے کا ۶۸ فیصد اور چنے کا ۷۵ فیصد پیدا کیا، جو کہ پاکستانیوں کی خوراک کا اہم حصہ ہے۔ ان اعداد و شمار کی بنیاد پر یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے صرف ایک سال ۱۹۶۴ء میں پنجاب کی زرعی دولت (فی کس آمدنی) ملک کے غریب صوبوں کے مقابلے میں کم از کم ڈھائی فیصد زیادہ تھی۔ یہ خلیج آہستہ آہستہ بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ یہ اعداد و شمار ۱۹۶۴ء کے ہیں اور یہ وہی عرصہ ہے جب نام نہاد 'سرسبز انقلاب' کا بھی خوب چرچا تھا۔ یہ سبز انقلاب اشرافیہ کاشت کاروں (elite farmer) کی زرعی ترقی کے لیے زیادہ موزوں تھا۔ سبز انقلاب دیگر غریب صوبوں کے مقابلے میں پنجاب میں مزید اور تیز رفتار پیداواری عمل کا باعث بنا۔ مثلاً صرف ۱۹۶۸ء تک مغربی پاکستان کے ۹۶ فیصد ٹیوب ویلز پنجاب میں نصب تھے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کاشت کاری کے لیے مہیا یہ اضافی پانی ہی تھا جس نے اس سرسبز انقلاب میں سب سے بنیادی کردار ادا کیا۔ ان ٹیوب ویلوں سے فراہم کیے جانے والے پانی کے باعث یہ ممکن ہو سکا کہ کھاد اور نئے بیجوں کے استعمال کو ملا کر کئی گنا اضافی فصلیں حاصل کی جا سکیں۔ اس طرح ۱۹۶۸ء میں مغربی پاکستان میں زیر استعمال کل ۱۶۵۰۰ ٹریکٹروں میں سے ۱۳۷۰۰ پنجاب کے پنجابی kulaks کے ہاتھوں

میں ہی تھے۔ان اعداد وشمار کی بنیاد پر دولت کی تقسیم کی تفصیلات کلی طور پر مہیا نہیں لیکن اس سے ایک بات کہی جاسکتی ہے کہ دولت کا محور (concentrations) ایک بار پھر پنجاب میں بڑی تیزی سے بڑھا۔جبکہ بقیہ دولت زیادہ تر انڈیا کے مغربی ساحلی علاقے سے ہجرت کر کے آنے والے گجراتی بولنے والے کاروباری پیشہ سے وابستہ کمیونٹی کے ہاتھوں میں تھی۔اس طرح بقیہ صوبوں کے اصل (indegenous) باشندے اس صنعتی سرمایہ کاری اور ترقی میں انتہائی ثانوی کردار اور حصہ داری رکھتے تھے۔مزید کہ کراچی کے ساحلی علاقے کو چھوڑ کر زیادہ تر صنعتی یونٹ پنجاب ہی میں لگائے گئے۔چھوٹے صنعتی یونٹوں میں بھی بیشتر پنجاب کے مختلف علاقوں مثلاً سیالکوٹ، گوجرانوالہ، گجرات، اور لاہور میں ہی لگے۔اس میں ایک بات کا اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ پنجاب میں بھی دولت کا مرتکز کچھ مخصوص علاقوں میں علاقائی بنیادوں پر ہوا ہے جس کی بنیاد پر بنجاب کے علاقوں میں دولت کی تفریق بڑھی ہے۔ مثلاً راولپنڈی کے اضلاع اور خوشحال کینال کالونی کے اضلاع میں موجود تفریق اس کی واضح مثال ہے۔

پاکستان میں یہ بڑھتی ہوئی خلیج حکومت کی اس پالیسی کا نتیجہ تھا جس میں نجی کاروبار (enterprise) کو سرکاری سرپرستی فراہم کی جارہی ہے۔اسی طرح سماجی طبقوں میں بھی دولت کی تقسیم واضح انداز میں دیکھی جاسکتی ہے۔مثلاً مغربی پاکستان میں زراعت سے کل صوبائی زرعی پیداوار دگنی سے زائد ہوچکی ہے۔لیکن کیونکہ ترقی کی رفتار صوبوں میں کافی سست رہی ہے،اس لیے پنجاب میں گذشتہ ایک دھائی میں زراعی آمدنی دگنی سے زیادہ ہوگئی ہے۔مزید یہ کہ زرعی آمدنی کا یہ مقامی افراط زر پنجاب کے چند علاقوں کے بڑے زمینداروں کے ہاتھوں میں ہی مرکوز رہا ہے۔۱۹۶۰ء کے زرعی شماری کے مطابق مغربی پاکستان کے ۸ فیصد فارمز 'بڑے فارمز' تھے جو کہ کل فارم علاقے کا ۴۲ فیصد بنتا ہے۔یہ صورتحال بھی حقیقت کو بیان نہیں کرتی کیونکہ یہ کاشتکاری کے یونٹ کو ظاہر کرتی ہے نہ کہ

یونٹ کی ملکیت کو۔۵۰ فیصد سے زائد کاشت کیے جانے والا فارمز کا علاقہ کرائے داری کی بنیاد پر آباد کیا جاتا ہے جو کہ یقیناً بڑے جاگیرداروں کی ہی ملکیت ہے۔اس طرح یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ زمین کی 'ملکیت' بہت بڑی حد تک چند ہاتھوں میں اور ان اعداد وشمار سے بہت زیادہ ہے جو کہ اس زرعی شماری میں دکھائے گئے ہیں۔

مغربی پاکستان میں زرعی زمین سے بڑھنے والی تمام اضافی آمدنی کا بہت بڑا حصہ پنجاب کے ان طاقتور اور بڑے زمینداروں (بے شک ان کی تعداد کم ہو) کے پاس ہی گیا ہے۔زرعی زمین کی آمدنی نے افراط زر کو جنم دیا ہے جس نے اشیاء صرف کی قیمتوں میں ہوش ربا اضافہ کر دیا ہے جس کے نتیجے میں وہ لوگ جو اس سے قبل ہی غربت کا شکار تھے ان کی اقتصادی حالت مزید زیادہ ابتر ہوگئی۔ان غریب لوگوں کے لیے اس ترقی نے غربت کو مزید بڑھایا ہے۔ غربت کے ستائے ہوئے صوبوں میں بلوچستان، سرحد (خیبر پختونخواہ) اور سندھ کے لوگ مزید غربت کی خط سے نیچے آ گئے ہیں۔ ان تمام صوبوں میں برابری کی بنیاد پر وسائل کی تقسیم اور ترقی کے عمل میں تمام صوبوں کو ساتھ لے کر چلنے کے لیے سیاسی احتجاج زور پکڑتا جا رہا ہے۔ان صوبوں کی طرف سے آبپاشی کے جائز پانی کی تقسیم اور صوبائی خودمختاری پر زور دیا جا رہا ہے۔ان تحریکوں میں اب صرف اقتصادی اور مالی معاملات کی ہی بات نہیں ہو رہی ہے بلکہ اب ان علاقوں کے لوگ اپنی ثقافتی اور لسانی شناخت پر بھی زور دے رہے ہیں۔ثقافتی اور لسانی شناخت پر شدت سے زور دینے کے باعث یہ معاملہ اب کافی گھمبیر ہو چکا ہے اور خصوصاً صوبہ سندھ کے تناظر میں چیزیں مزید الجھن کا شکار ہیں کیونکہ سندھ کی شہری آبادی کا ایک بڑا حصہ ان اردو بولنے والے مہاجرین پر مشتمل ہے جو کہ تقسیم کے وقت ہندوستان سے ہجرت کر کے یہاں منتقل ہوئے اور اب سندھ کے شہروں میں واضح اکثریت رکھتے ہیں جبکہ دیہی آبادی، سندھی بولنے والوں پر مشتمل ہے۔لسانی تعصب کا معاملہ یہاں بنیادی نوعیت کا بن چکا ہے جس نے

شہری محنت کشوں اور دیہی کسانوں کو ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا ہے۔لیکن اس کے باوجود علاقائی اور لسانی تحریکیں اصل مادی (material) مسائل پر ہی زور نہیں دے رہی۔ ان مسائل کو ضرور حل کیا جانا چاہیے۔ ان مسائل کے باعث مغربی پاکستان میں مرکز مخالف (centrifuged) قوتیں جنم لے رہی ہیں۔مشرقی بنگال کا مسئلہ مغربی پاکستان کی موجودہ صورتحال کو مزید گھمبیر بنا سکتا ہے۔لیکن یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ مغربی پاکستان میں موجود سماجی ناہمواری کے مسئلے کو صرف علاقائی خودمختاری سے ختم نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کا واحد حل متحد ہو کر مغربی پاکستان میں سوشلسٹ نظام قائم کرنے اور اسکو موجودہ استحصالی نظام سے نجات حاصل کرنا ہوگا جو کہ نہ صرف اپنی فطری اساس کے باعث نہ صرف معاشرے کے مختلف طبقوں بلکہ ملک کے مختلف علاقوں کے درمیان بھی سماجی ناہمواری کو جنم دے رہا ہے۔

اس سیاسی جدوجہد کو سوشلزم کی جدوجہد سے منسلک کر کے علاقائی خودمختاری کی بات کرنے کے لیے ایک مخصوص طبقے کی ضرورت ہے۔ یہ خصوصی کردار پڑھا لکھا درمیانی طبقہ بخوبی انجام دے سکتا ہے۔ یہ کام درمیانی طبقہ بعد از نوآبادیاتی (post colonial) معاشروں میں بخوبی سرانجام دیتا چلا آیا ہے۔اس طبقے کی فطرت اور اس کا کردار بعد از نوآبادیاتی معاشروں کی سیاست میں بڑی اہمیت کا حامل سوال بن گیا ہے۔لیکن یہ ایک ایسا سوال ہے کہ جس پر مارکسی دانشوروں نے بڑی ہی کم توجہ دی ہے۔ یہ بڑا اچھا ہوگا کہ اگر ہم اس مسئلے کو موجودہ صورتحال کے تناظر میں پاکستان کے حکمران (oligarchy) کی نشان دہی کرتے ہوئے اس کی طبقاتی بنیادوں اور وفاداری کا جائزہ لیں۔ میں کسی اور جگہ پر (۴) یہ بات کہہ چکا ہوں کہ یہ الجھا ہوا مسئلہ بعد از نوآبادیاتی ریاست میں طبقاتی بنیادوں پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ میں یہ بات کہتا ہوں کہ بعد از نوآبادیاتی معاشروں میں فوج اور نوکر شاہی کو کلاسیکل مارکسی نقطہ نظر سے واحد حکمران طبقے کے آلہ کار (instruments) کے

طور پر نہیں دیکھنا چاہیے۔ پوسٹ کلونیل معاشروں کے تاریخی تجربے اور خصوصی فطری حالات کی وجہ سے یہ رشتے بہت گمبھیر ہو چکے ہیں۔مغربی معاشروں کی تاریخی ترقی کے تناظر میں یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ ریاست کی تشکیل میں مقامی بورژواری نے انتہائی اہم کردار ادا کیا۔اس صورتحال میں معاملات کے اس قدر سادہ ہونے پر سوالات اٹھائے جاسکتے ہیں کیونکہ درحقیقت یہ عمل کافی پیچیدہ ہے۔لیکن پوسٹ کلونیل معاشروں میں تاریخی عمل یورپین معاشروں کے مقابلے میں معیاری(qualitatively) طور پر کافی مختلف ہے۔ یہ ان کے نوآبادیاتی دور کے تجربات پر مشتمل ہے جو کہ ان کے منفرد اور مخصوص کردار کو متعین کرتا ہے۔

نوآبادیاتی نظام کے بعد کے معاشروں میں ہم بورژوائی انقلاب کا بڑا ضروری کردار دیکھ رہے ہیں۔اب تک ایک بورژوا ریاست کے قیام اور ریاستی اداروں وقانونی ڈھانچے کے قیام میں (جو کہ پیداوار کے سرمایہ دارانہ رشتے بنانے کے لیے نہایت ضروری ہے) بورژوا انقلاب نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے جو کہ ایک انقلابی کام ہے۔اس سے قبل یہی کام نوآبادیاتی دور میں میٹروپولیٹن بورژواری بخوبی انجام دیتی رہی۔نوآبادیاتی ریاستیں ایک اضافی تبدیلی کے عمل سے گزریں جس سے کہ میٹروپولیٹن بورژواری کو نہ گزرنا پڑا۔کیونکہ نوآبادیاتی ریاست کو نوکرشاہی اور فوج کو استعمال کرتے ہوئے حکمرانی کا ایک ایسا ڈھانچہ وضع کرنا پڑا جس کے ذریعے وہ اپنی بنائی کالونی میں مقامی سماجی طبقوں پر باآسانی اپنا کنٹرول قائم رکھ سکیں۔نوآبادیاتی نظام کے بعد کے معاشروں کو ریاست کا یہ نظام اور ان کی روایات (practices) ورثہ میں ملیں جو کہ مقامی سماجی طبقات پر اپنا مکمل کنٹرول اور گرفت رکھتے تھے۔نوآبادیاتی نظام کے خاتمے اور آزادی پانے کے بعد لاغر اور کمزور مقامی بورژواری کا فوری واسطہ / سامنا اس نوکرشاہی سے پڑا جو کہ آزادی سے قبل بھی نظام چلا رہی تھی اور آزادی کے بعد یہی نوکرشاہی اور فوجی طبقہ مل کر حکمران بن کر عام لوگوں کی

سرگرمیوں اوران کے مستقبل کو کنٹرول کرنے والے بن گئے۔

کلاسیکل مارکسی نظریہ یہ سمجھتا ہے کہ کسی بھی ریاست کا بالائی ڈھانچہ (super-structure) معاشرے کی اقتصادی بنیادوں کے ڈھانچے کے مطابق ڈھلتا ہے یعنی اس معاشرے کے سرمایہ دارانہ تعلقات پیداوار اور اس ملک کی ابھرتی ہوئی بورژواری۔ لیکن نوآبادیاتی معاشروں میں ہم صورتحال اس کے برعکس دیکھتے ہیں کہ جہاں ریاست کے بالائی ڈھانچے نے ترقی کے عمل میں ڈھانچے کی ترقی اور معاشرے کی اقتصادی بنیادوں اور مقامی بورژواری کے ابھرنے پر سبقت حاصل کر لی ہے۔ اس طرح یہ بات یقینی کہی جاسکتی ہے کہ نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد آزاد ہونے والی ریاستوں میں ریاست کا بالائی ڈھانچہ (super structure) مقامی بورژواری اور پسماندہ اقتصادی ڈھانچے کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ (over developed) تھا۔ یہ نوآبادیاتی صورتحال میں زیادہ ترقی یافتہ نہ تھا کیونکہ اس وقت اس کی بنیادیں نوآبادیاتی معاشرے کی اقتصادی بنیادوں اور میٹروپولیٹن بورژواری میں تھیں۔ زائد ترقی (over developed) کا رجحان اس وقت سامنے آیا جب آزادی کے موقع پر جب اس بالائی ڈھانچے کا رشتہ میٹروپولیٹن اقتصادیات کے ساتھ ٹوٹا جب سابقہ نوآبادیاتی معاشرے کو پورے نظام سے آزادی ملی۔ اس مرحلے پر یہ سوال اٹھنا چاہیے تھا کہ نئے بدلے ہوئے حالات میں نئی آزاد ریاستوں میں زیادہ ترقی یافتہ ڈھانچہ کا مقامی پسماندہ اقتصادی نظام سے بہت آگے تھا ان کا بعد از نوآبادیاتی معاشرے کے ساتھ کس قسم کا تعلق ہونا چاہیے؟ زیادہ ترقی یافتہ بالائی ڈھانچے اور پسماندہ ڈھانچے کا یہ تضادی پہلو نوآبادیاتی یا قبل از نوآبادیاتی دور میں سامنے نہیں آ سکتا تھا کیونکہ اس کا تعلق مکمل طور پر اس صورت حال سے ہے جو نوآبادیاتی دور کے اختتام پر ان آزاد ہونے والے معاشروں میں سامنے آئی۔

نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد سامنے والے کمزور اور پسماندہ مقامی

(domestic) سماجی طبقات کو ایک تقریباً سماجی انقلاب لائے بغیر ایک ناممکن کام سرانجام دینا تھا اور وہ کام تھا ریاستی نظام (apparatus) کو اپنے تابع لانا جو کہ ماضی میں اپنے تابعدارانہ تعلقات کو ایک مکمل ادارتی (institutionalized) شکل دے چکے تھے۔ لیکن نوآبادیاتی نظام کے خاتمے پر سامنے آنے والے معاشروں میں مقامی بورژواری اور نوکرشاہی وفوجی oligarchy کی صورت میں صرف دو عناصر ہی ایسے نہیں رہے جو کہ ریاست کے نظام پر مکمل طرح حاوی ہو کر اس کو کنٹرول کر سکیں۔ اب تک میٹروپولیٹن بورژواری نے ان آزاد ہونے والے ممالک میں اپنے نوآبادیاتی مفادات کو خیرباد نہیں کہا ہے۔ بلکہ یہ اپنی شکل بدل کر نئی صورتحال میں دوبارہ داخل ہوگئی ہے۔ ان معاشروں میں یہ اب دیگر ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک کی مسابقتی (competing) بورژواری کو ساتھ ملا کر نئے نوآبادیاتی (neo-colonial) رشتے استوار کرنے لگی۔ لیکن معیاری (qualitatively) طور پر اور خصوصاً سیاسی طریقۂ واردات میں نوآبادیاتی دور سے کافی حد تک مختلف ہے۔ آخر میں یہ کہ نوآبادیاتی نظام کے خاتمے پر سامنے آنے والے معاشروں میں ایک مقامی جاگیردار طبقے بھی ہے جو اب بھی سیاسی طور پر بڑا طاقتور ہے کیونکہ ان کے بیٹوں نے نوکرشاہی اور فوج میں شمولیت اختیار کرتے ہوئے ریاستی نظام پر اپنی گرفت بڑی مضبوط کر لی ہے جبکہ جاگیرداروں نے بالغ حق رائے دہی پر عمل کرتے ہوئے ملک کے جمہوری سیاسی نظام پر بھی اپنی بالادستی قائم کر لی ہے۔ عالمی جمہوری سیاسی نظام (بالغ رائے دہی) کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے سیاسی ڈھانچے میں اپنے لیے مستحکم مقام حاصل کر لیا ہے۔

پاکستان کا تجربہ یہ بات بتاتا ہے کہ یہ تینوں مالکانہ (properited) طبقات یعنی مقامی بورژواری، نئی (neo) نوآبادیاتی بورژواری اور جاگیردارانہ طبقات نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد کے معاشرے کے ریاستی نظام (apparatus) کو تنہا چلانے کو پوزیشن

میں نہیں ہیں کیونکہ کسی ایک کے اثر اور طاقت کو بقیہ دو زائل کر دیتے ہیں۔ یہ تینوں گروہ نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد کی ریاست سے اپنے اپنے مطالبات شروع کر دیتے ہیں۔اس میں نوکر شاہی اور فوج کا مشترکہ گروہ جس کے ہاتھوں میں ریاست کا کنٹرول بھی ہے وہ سب سے پہلے اپنے مفادات کی تکمیل کے ساتھ ساتھ بقیہ تینوں گروہوں کے درمیان رابطہ کاری کا کردار ادا کرتے ہوئے انہیں مطمئن رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔فوج اور نوکر شاہی کا یہ مصالحتی کردار اس کو نسبتاً ایک آزاد اور بقیہ تینوں گروہوں سے ایک بالاتر مقام دے دیتا ہے۔سب سے اہم بات یہ ہے کہ نوکر شاہی اور فوج ان گروہوں میں رابطہ کاری کا کام تو سرانجام دیتی ہے لیکن یہ اس بات کی اجازت بالکل نہیں دیتی کہ اسے ان تینوں میں سے کسی ایک بھی گروہ کے زیر نگین ہو کر کام کرنا پڑے۔

فوج اور نوکر شاہی ٹھیکیداری (oligarchy) کا کردار نسبتاً خود مختار ہے کیونکہ اس کا تعین طبقاتی معاشرے کے (matrix) میں ہوتا ہے نہ کہ اس سے باہر۔ معاشرتی نظام (social order) کے تحفظ کا مفاد ان مقابل تینوں طبقوں کو نوکر شاہی اور فوج کی زیر قیادت ایک جگہ اکٹھا کر دیتا ہے۔فوج اور نوکر شاہی کی سرپرستی ان طبقوں کو یہ یقین دہانی فراہم کرتی ہے کہ وہ ان سب طبقوں کو ان تمام عوامی تحریکوں سے تحفظ فراہم کرے گی جو کہ ان کے وجود کو چیلنج کرتے ہوئے ان کے لیے خطرہ کی علامت بن جاتے ہیں۔اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ نوکر شاہی اور فوج کا کردار نسبتاً آزاد (autonomous) ہے کیونکہ آزادی کے حصول کے ساتھ میٹروپولیٹن بورژوازی کے کنٹرول کرنے والے ہاتھ کے غائب ہو جانے کے بعد اب کوئی ایسا واحد طبقہ نہیں جو ان طبقات کی تنہا قیادت (Command) کر سکے۔ میٹروپولیٹن بورژوازی کے خاتمے کا صرف منفی پہلو ہی نہیں بلکہ اس کا ایک اضافی مثبت پہلو یہ ہے کہ یہ نئے بدلتے ہوئے حالات میں ریاست کو ایک نیا اقتصادی کردار ادا کرنے کا نادر موقع فراہم کرتا ہے جو کہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت

ترقی کا عمل شروع کرسکتی ہے۔ ریاست اس صورتحال میں نہ صرف اقتصادی حرکات (activity) کو باقاعدہ(regulate) کرسکتی ہے بلکہ اس کے نتیجے میں زائد سرمایہ (surplus) بھی پیدا کرسکتی ہے جو وہ نوآبادیاتی دور کے خاتمے کی صورت حال میں مزید ترقی کے لیے زیر استعمال لاسکتی ہے۔

ان تین مالکانہ (properited) طبقات کے مسابقتی (Competing) مطالبات میں نوکر شاہی اور فوجیoligrachy کا کردار نوآبادیاتی صورتحال کے خاتمے کے بعد مصالحتی ہوسکتا ہے کیونکہ ان سب کے مشترکہ مفادات اور باہمی تعلقات بڑی حد تک ہم آہنگ ہوجاتے ہیں جن کا تجربہ ہم مارکیٹ کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں جو کہ اکثر حالات میں ہمیں باآسانی نظر آجاتے ہیں۔ نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد اب ان کے مفادات تضادی اور اختلافی نہیں رہے اس کے برعکس اب تو یہ آپس ہی میں مقابلہ کرتے اور مصالحتی راستہ اختیار کرتے ہوئے دیتے ہیں۔ کلاسیکل مارکسی نظریہ بتاتا ہے کہ ان تین طبقات کے درمیان اتحاد (coalition) موجود ہوتا ہے یعنی میٹروپولیٹن بورژواری اور ان کا مقامی(native comparates) طبقہ (جو کہ ان تاجروں پر مشتمل ہوتا ہے جن کی حرکات میٹروپولیٹن بورژواری کی مددگار ہوتی ہیں) اور تیسرا طبقہ 'جاگیر' زمین مالکان ہیں۔ اس نظریے سے ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ابھرتی ہوئی مقامی بورژواری بنیادی طور پر میٹروپولیٹن بورژواری کی مخالف ہوتی ہے اور نوآبادیات سے آزادی بورژواری جمہوری انقلاب کی صورت اختیار کرلیتی ہے جو کہ تاریخی مرحلے میں انتہائی اہم مرحلہ ہوتا ہے جس کے نتیجے میں بالآخر میٹروپولیٹن بورژواری کی بالادستی کا خاتمہ کرکے مقامی بورژواری اس کا مقام حاصل کرلیتی ہے۔ لیکن یہ بات گوشہ نشین رہنی چاہیے کہ نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کی صورت میں ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا جیسا کہ پال بران (Paul Baran) لکھتا ہے:

''یہ سرمایہ دار (یعنی بورژواری کا حصہ) جو کہ ابتدائی درجے میں سماجی انقلاب کی بچی کچی باقیات (spectre) سے لڑتے ہوئے بڑی تیزی سے ان کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے جو کہ گذشتہ کل تک اس کے شریک سفر تھے لیکن وہ آئندہ کل اس کے جانی (mortal) دشمن ہوں گے (یعنی پرولتاریہ (محنت کش) اور کسان)۔ درحقیقت سرمایہ دار بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ساتھ ان جاگیرداروں کے ساتھ بھی اتحاد بنانے میں دیر نہیں کرتا ہے جو کہ خود اس کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ بنتے ہیں۔ یہ سب کچھ ان حالات میں ہو رہا ہوتا ہے کہ استعماری حکمرانوں کو قومی آزادی کی تحریکوں کے نتیجے میں دیس نکالا دیا جاتا ہے اور ان کے مددگار گروہ اپنے بیرونی حاشیہ برداروں کی شکست کے بعد اپنے آپ کو سیاسی طور پر مفتوح پاتے ہیں'' (۵)

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ نوآبادیات کے خاتمے کی صورت میں ابھر کر سامنے آنے یہ تینوں مالکان (properited) طبقات اس موجودہ سماجی نظام کے دفاع میں اکٹھا ہو جاتے ہیں جس میں کہ ان کے طبقاتی مفادات بڑی مضبوطی سے پیوست ہوتے ہیں اور یہ سب کچھ انقلابی تحریکوں کے سامنے آنے کے بے نظیر (unprecendented) چیلنجز کی موجودگی میں ہو رہا ہوتا ہے۔ لیکن یہ کلی وضاحت نہیں۔ ایک خیال یہ ہے کہ بورژواری کا روایتی جاگیرداری مخالف، (anti-feudal) اور 'استعمار مخالف' 'anti-imperlist' کردار کو مسترد کرنے کے کردار کے پس پشت وہ خوف اور خدشات ہیں جن کہ وہ انقلابی حالات کے پیدا ہونے کی وجہ سے مبتلا ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان طبقات کا یہ تجزیہ نوآبادیاتی صورتحال کی روشنی میں ہوتا ہے نہ کہ تبدیل شدہ صورتحال (یعنی نوآبادیات کے خاتمے کی صورت میں)۔ نوآبادیاتی دور کے خاتمے پر بورژوار اور 'جاگیردار' طبقات میں ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو برداشت کرنے کی ممکنات موجود ہیں، کیونکہ آزادی کے بعد قومی ریاست اور قومی آزادی کا حصول اور 'جاگیردار' قوت (feudal power) کی بورژوار

ریاست کے آگے سرنگوئی(subordination) کا مرحلہ ایسا ہے جس کا کہ مقامی (native) بورژواری کو سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ جب کہ دوسری طرف نوآبادیاتی صورتحال کے خاتمے کے بعد کی ریاست کو 'جمہوری' انداز میں چلانے میں 'جاگیردار' طبقہ کا بڑا اہم کردار ہے۔ان جاگیرداروں کا ریاست اور دیہی علاقوں کے مقامی سطح کے قوتی ڈھانچوں (local level power structure) میں تعلق (link) بنانے میں بڑا مرکزی کردار ہے۔ یہ جاگیردار امکانی انقلابی قوتوں کو محدود کرنے اور نوآبادیاتی دور کے بنائے گئے ڈھانچے کو برقرار رکھنے میں بڑے مرکزی اہمیت کے حامل ہیں۔لیکن جہاں تک بورژواری اور 'فیوڈل' طبقات کے رشتوں کے اقتصادی پہلو کی بات ہے تو جاگیردارانہ مالکانہ نظام کے تحت سرمایہ دارانہ زراعت(capital farming) کی نمو کے بعد اب سرمایہ دارانہ نظام کے قیام کے لیے جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کی بات کرنا غیر ضروری ہوگئی ہے۔کئی ممالک میں آزادی کے بعد عمومی (perfunctary) کوششیں کی گئیں کہ وہ وہاں زرعی اصطلاحات کا نفاذ کیا جائے۔عمومی طور پر یہ اقدامات نہ تو کوئی موثر ثابت ہوئے بلکہ یہ بھی (جو کہ اس تناظر میں بڑی اہمیت کا حامل ہے) اس جاگیرداری نے مقامی(native) بورژواری کی ترقی میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ یا پھر اس کے مفاد کو کوئی سنجیدہ ضرب نہیں لگائی۔حالیہ برسوں میں نام نہاد 'سبز انقلاب' نے (جو کہ 'اشرافیہ کاشتکار')(elite farmer) کی منصوبہ بندی(strategy) کی بنیاد پر مرتب کیا گیا) ملک میں زائد زرعی اجناس جو کہ ملک میں شروع ہونے والے صنعتی عمل اور شہری مراکز(urbanization) کو قائم رکھنے کے لیے نہایت ضروری ہے اور ساتھ ہی یہ تیار شدہ اشیاء(manufactured goods) کے لیے مقامی منڈی پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے۔سبز انقلاب کا منفی پہلو یہ تھا کہ اس کے ذریعے بڑے زمینداروں نے خوب منافع کمایا نہ کہ بورژواری نے۔لیکن اس صورتحال کے باعث اصل تکلیف دیہی اور شہری علاقوں کے غریب کو ہی اٹھانا پڑی۔اس مضمون کے

سبق میں اب یہ ممکن نہیں کہ اس سوال پر مزید بات کی جائے۔لیکن ہم اپنی بات اس نقطے پر ختم کر سکتے ہیں کہ جاگیرداروں اور بورژواری کا باہمی تعاون بالائی ڈھانچے کے سیاسی حالات کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ یہ اس ڈھانچے کے اقتصادی حالات سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔

مقامی(indigenous) بورژواری اور میٹروپولیٹن بورژواری کے درمیان باہمی تعلقات کی نوعیت کلاسیکل نظریہ سے معیاری(qualitative) طور پر کافی مختلف ہے۔ کلاسیکل نظریہ بتاتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان بنیادی نوعیت کے تضادات موجود ہیں۔ اس لیے نوآبادیاتی معاشروں میں بورژوا جمہوری انقلاب (چاہے وہ محنت کشوں کے بجائے نوزائیدہ(nescent) بورژواری ہی کیوں نہ لائے) وہ لازمی طور پر اپنے کردار میں استعمار مخالف ہی ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ آزادی کے حصول تک کے مرحلے میں چلنے والی قومی تحریک میں بورژواری بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔لیکن نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد کی صورتحال میں ہم دونوں یعنی مقامی (indigenous) بورژواری اور سابقہ Comprador calss جو کہ تاجروں اور تعمیری (building) ٹھیکیداروں پر مشتمل ہے، ان کے رجحانات(oreintation) میں بالکل مختلف پن پاتے ہیں۔ Comprador Class بیرونی ممالک کے بڑے کاروباری سے مقابلہ نہ کرنے کے باعث اس بات کا مطالبہ شروع کرتا ہے کہ بیرونی کاروباروں پر پابندیاں عائد کی جائیں خصوصاً ان شعبوں میں جہاں انہیں بیرونی بورژواری سے مقابلہ کرنا ہو۔اس صورت میں یہ ایک نئے 'استعمار دشمن' کی صورت (posture) اپنا لیتے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف جیسے ہی مقامی(domestic) بورژواری اپنے حجم میں بڑھتی ہے اور آہستہ آہستہ ان صنعتوں سے جو کہ نسبتاً سادہ(unsophisticated) ہوتی ہیں (مثلاً جیسے ٹیکسٹائل کی صنعت) سے آگے بڑھ کر ان صنعتوں میں دلچسپی لینا شروع کر دیتی ہے جو کہ نسبتاً زیادہ بہتر (highly sophisticated) ہوتی ہیں (مثلاً کھاد بنانے والی یا پھر پیٹروکیمیکل وغیرہ) اس مرحلے

پر انہیں احساس گزرتا ہے کہ ان کے پاس نہ ہی وہ اعلی درجے کی ٹیکنالوجی ہے اور نہ ہی ان کے پاس مطلوبہ وسائل اور نہ ہی ان کے کاروبار اتنے وسیع ہیں کہ وہ اس ٹیکنالوجی کو حاصل کر کے اپنی ترقی کو آگے بڑھا سکیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ میٹروپولیٹن بورژواری کے ساتھ تعاون کا سلسلہ بناتے ہیں۔ وہ یہ تعاون اس صورتحال کے باوجود کر لیتے ہیں کہ اس تعاون کی شرائط کے باعث انہیں مستقبل میں اپنی آزادانہ ترقی میں کافی رکاوٹیں کھڑی مل سکتی ہیں۔ مقامی (native) بورژوا طبقہ نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد کے معاشروں میں آزادانہ ترقی کی بنیادیں فراہم نہیں کر سکتا۔ اس لیے یہ لازماً تعاون کی راہ اپناتے ہیں۔ اس لیے مقامی (native) بورژواری اور میٹروپولیٹن بورژواری کا باہمی رشتہ اب مخصمت پر نہیں بلکہ تعاون پر مشتمل ہے۔ لیکن یہ تعاون درجہ بندی (hierarchial) کی بنیادوں پر ہوتا ہے۔ اس رشتے میں مقامی بورژواری کی حیثیت ثانوی (subordinate) کی ہوتی ہے۔ اس طرح نوآبادیاتی کے خاتمے کے بعد وجود میں آنے والی صورتحال میں مقامی بورژواری کا کردار استعمار مخالف کے بجائے مددگار (collaborationist) بن جاتا ہے۔ میٹروپولیٹن بورژواری مقامی بورژواری سے اس تعاون پر بخوشی تیار ہو جاتی ہے کیونکہ اس کے کئی فوائد ہوتے ہیں مثلاً مقامی بورژواری کے اس طرح تعاون کرنے کے بعث وہ سیاسی خطرے (risk) سے بھی اپنے آپ کو بچا لیتے ہیں جو کہ عموماً براہ راست ہونے والی بیرونی سرمایہ داری سے منسلک ہو جاتا ہے۔ مقامی بورژواری ایک طرح سے انہیں بیمہ (انشورنس) فراہم کرنے کا باعث بنتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ تعاون میٹروپولیٹن بورژواری کو ایک یقینی منڈیاں بھی فراہم کر دیتی ہے جہاں وہ اپنی ٹیکنالوجی اور دیگر اشیاء فروخت کر سکتے ہیں وہ حالات جو کہ اس باہمی تعاون کا سبب بنتے ہیں وہ دراصل نوآبادیات کے خاتمے کے بعد کے آزاد ہونے والے معاشرے کے ڈھانچے اور ساتھ ہی ساتھ بالائی ڈھانچے میں پیوست (embedded) ہوتے ہیں۔

اس لازماً لیکن مختصر نظریاتی بحث کے ذریعے اس انتہائی پیچیدہ اور تضادات کا مکمل اور تفصیلاً جائزہ نہیں لے سکتے جس کے باعث سیاسی عمل میں مختلف طبقات کے مطالبات کے سامنے آنے کے باعث فوج اور نوکر شاہی (oligarchy) ان طبقات کے درمیان اپنا اثر ونفوذ استعمال کرتے ہوئے مصالحت کاری کا کردار ادا کرتی ہے۔ یہ اس لیے ہے کیونکہ اول تو فوج اور نوکر شاہی کو کسی بھی طرح یکساں (monolithic) نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ یہ دھڑوں میں تقسیم ہے۔ طاقت اور حاکمیت کے لیے جدوجہد کے باعث اس (oligarchy) میں سازشیں جنم لیتی ہیں اور ہر طرح سے اس کی کوششیں کی جاتی ہیں کہ سیاسی جماعتوں سے اتحاد بنا کر اپنی حیثیت کو مستحکم کیا جائے۔ نوکر شاہی اور فوج (oligrachy) ٹولے کی یہ دھڑے بندیاں کسی نظریاتی مسائل کی وجہ سے نہیں ہیں بلکہ یہ ان گروہوں کے مفادات کی جنگ ہیں جو ان کو الگ الگ دھڑوں میں بانٹ دیتی ہیں لیکن اس کے برعکس سیاسی لوگ نظریاتی بنیادوں پر تقسیم ہوتے ہیں۔ ان کے سیاسی جماعتوں سے رابطے جو کہ برقرار رہتے ہیں، نہایت مشکل (tenuous) ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ نوکر شاہی فوجی (oligarchy) کبھی متحد ہو کر یا کبھی مختلف دھڑوں کی صورت میں ہی ان تمام مخصوص مطالبات سے براہ راست سودے بازی (deal) کرنا شروع کر دیتے ہیں جو کہ معاشرے سے سامنے آتے ہیں۔ مختلف سماجی طبقے اپنے مطالبات کا اظہار سیاسی جماعتوں کے ذریعے نہیں کرتے بلکہ براہ راست اس oligarchy میں موجود مختلف دھڑوں میں اپنے قائم رابطوں کا فائدہ لیتے ہوئے آگے بڑھاتے ہیں۔

جہاں تک ان مالکان (properited) طبقات کی بات ہے جنہوں نے کہ حکمران (oligarchy) کے ساتھ اپنا براہ راست تعلق پیدا کر لیا ہے ان کے لیے سیاسی جماعتوں سے کسی بھی قسم کا تعلق استوار کرنا کوئی خاص سودمند نہیں۔ اس لیے سیاسی جماعتوں کا کردار بڑی حد تک غیر اہم ہو کر رہ گیا ہے۔ بائیں بازو کی جماعت کو استثنا دیئے، باقی جماعتیں

صرف اس وجہ سے اپنا وجود برقرار رکھتی ہیں کیونکہ پارلیمانی حکومت کا وجود قائم ہے۔ حکمران (oligarchy) کے لیے ان کی اہمیت یہ ہے کہ ان سیاسی جماعتوں کے وجود کی صورت میں ان حکمرانوں کو ایک دکھاوے کا جمہوری چہرہ (facade) دکھانے کا موقع مل جاتا ہے اور اسی کی بنیاد پر وہ اپنی حکمرانی کو سیاسی جائزہ (legitimacy) فراہم کرتے ہیں۔ اس کے ذریعے لوگوں میں جمہوریت اور حکومت میں مقبول عوامی شمولیت کی خواہش کو بھی زندہ رکھا جاسکتا ہے اور کسی حد تک انہیں مطمئن بھی کیا جاسکتا ہے۔

'حکمران سیاسی جماعتیں' ضروری نہیں کہ نوکر شاہی، فوج (oligarchy) کی آسان اور لچک دار آلئہ کار (pliant instruments) ہوں اور نہ ہی یہ oligarchy ان سیاسی جماعتوں کا آلہ (instrument) ہے۔ ان دونوں (سیاسی جماعتوں اور نوکر شاہی فوج) کے درمیان تناؤ اور باہمی برداشت بھی قائم رہتی ہے۔ اس تناؤ اور برداشت کے تعلق کی ایک بہترین جھلک ان رشتوں سے دیکھی جاسکتی ہے جو آزادی سے قبل اور اسکے بعد ان کے درمیان قائم رہے۔ آزادی سے قبل نوکر شاہی اور فوج کا ادارہ میٹروپولیٹن بورژواری کا آلہ (instrumnet) تھا اور وہ میٹروپولیٹن بورژواری کے مفادات کو تحفظ دینے کے لیے قومی تحریکوں کو کچلتا (repression) تھا۔ لیکن بعدازاں ان ہی تحریکوں کے رہنماؤں نے ریاست کے مرکز طاقت پر قانونی (legtimate) طریقے سے حق حکمرانی حاصل کیا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ماضی کے رشتوں کے باعث یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے کسی حد تک اجنبی تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ لیکن اب کئی ممکنات کی بنیاد پر ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ مختلف ممالک میں ان کے علاقائی تجربات و حالات کی بنیاد پر مختلف حالات رہے ہیں۔ جنوبی ایشیا میں آزادی کے بعد بھی نوکر شاہی فوج کا ادارہ بڑی مضبوطی سے کام کرتا رہا اور یہ گذشتہ حالات کا تسلسل ہی بن گیا۔ آزادی کے بعد قومی قیادت اور نوکر شاہی فوج نے اس دوسرے کو باہمی برداشت کے لیے ایک طریقہ وضع کرلیا۔ اس رشتے کا

توازن انڈیا اور پاکستان میں بالکل مختلف طرز اور شکل میں سامنے آیا۔

نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد سامنے آنے والی ریاستوں میں نوکر شاہی فوج (oligarchy) اور سیاسی جماعتوں کے درمیان استوار ہونے والے نئے رشتوں میں کچھ عمومی نوعیت کے حالات شامل تھے۔ اوّل تو یہ کہ وہ سیاسی جماعت جس نے آزادی کی عوامی تحریک کی قیادت کی تھی اور جسے عوامی مقبولیت حاصل تھی وہ نوآبادیات کی جائز وارث ٹھہری اور انہیں حکمرانی کا قانونی جواز حاصل تھا اور ایک سیاسی جماعت کے طور پر انہیں نئے آزاد ممالک کی قانون ساز اسمبلی یا پارلیمان میں واضح اکثریت بھی حاصل تھی۔ یہ سیاسی نظام نوکر شاہی فوج (oligarchy) کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ سیاستدانوں کو اس نظام میں شریک کرلیا جاتا ہے۔ جہاں نوکر شاہی فوجی (oligarchies) کو اقتدار پر مکمل غلبہ حاصل ہو۔ لیکن قوت، عوامی ذمہ داری اور احتساب کا رشتہ (nexus) ٹوٹ جاتا ہے اور احتساب کا بوجھ سیاستدانوں کے کاندھوں پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ سیاسی قیادت اس oligarchy کو تحفظ فراہم کرتی ہے۔ دوئم یہ کہ ان کا باہمی رشتہ حکمران (regime) اور مقامی سطح کے طاقتی ڈھانچے جو معاشرے میں بنیادی سطح (root level) پر کام کرتا ہے (مثلاً جاگیردارانہ نظام) ان کے درمیان ایک تعلق پیدا کرتا ہے نہ کہ مقامی سطح کے ڈھانچے کو حکمرانوں (regime) سے بیگانہ کر کے ان کو یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ حزب اختلاف کے قریب جا کر حکمران پر حملہ آور ہو جائیں۔ اس لیے سیاسی قیادت اس نوکر شاہی فوج oligrachy کے لیے ایک اثاثے کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن نوکر شاہی اور فوجی oligrachy کے اس حد تک سیاسی قیادت پر انحصار کرنے کے باعث ان سے کچھ مطالبات بھی کیے جاتے ہیں اور ان کی حدود کے تعین کی بات بھی ہوتی ہے۔ وہ اس بڑھتے ہوئے اس قدر طاقتور بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کے مفاد کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ جب بھی ایسی کوئی صورتحال سامنے آتی ہے تو ایک سیاسی بحران کے آنے کی بات کر کے

oligarchy اقتدار پر 'قابض' ہوجاتی ہے اور پھر اپنے نام پر حکمرانی شروع کر دیتی ہے۔ اور فوج کو عمومی طور پر قومی اتحاد اور قومی مفادات کا 'محافظ نگران' بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

پاکستان میں حکمران (مجموعی طور پر پنجابی) oligrachy نے مسلمان قوم پرستی کے نعرے پر نہ صرف اپنا قبضہ جما لیا بلکہ اس کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں۔ یہ نعرہ دراصل بڑی اہمیت اور طاقت کا حامل ہے کیونکہ اس کی بنیاد پر ہی یہ ملک حاصل کیا گیا تھا۔ یہ 'اسلامی اخوت' پر زور دیتے ہوئے اپنی مخالف تحریکوں کو 'صوبائیت' پھیلانے کا الزام دیتے ہوئے اس کی مخالفت کرتا ہے۔ اس طرح سے قیام پاکستان کے بعد مسلم 'قوم پرستی' کا تصور (nature) اور اس کی افادیت تبدیل ہوگئی ہے۔ اور اب اس نعرے کو حکمران oligrachy اپنے مقاصد کے حصول کے لیے بھرپور طریقے سے استعمال کر رہے ہیں۔ مسلمان قوم پرستی ہندوستان کے محروم (under prviligied) پڑھے لکھے درمیانے درجے کے مسلمانوں کے حقوق کی نمائندہ بن گئی جو کہ تعلیمی طور پر ہندوؤں سے کافی پیچھے تھے۔ پاکستان کا قیام اس کے اس کردار کی تکمیل تھا اس لیے پاکستانی کی ریاست کے قیام کے ساتھ ہی اس تحریک کا خاتمہ ہوگیا۔ اس مرحلے پر اس تحریک کا بنیادی عنصر (principal organ) یعنی مسلم لیگ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی۔ اس جماعت کے باقی بچ جانے والے حصے نے مسلم لیگ کے سابقہ پروپیگنڈہ کو دوبارہ زندہ کر کے مراعات یافتہ طبقات خصوصاً پنجابی oligrachy کی مدد سے دوبارہ مقبول بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ اسلامی اتحاد کا تصور بطور نظریہ صرف اس مقصد کے تحت استعمال کیا جا رہا ہے تاکہ کم مراعات یافتہ (less previliged) گروہوں مثلاً بنگالیوں، سندھیوں، پٹھانوں، بلوچوں کی علیحدہ شناخت کے مطالبے اور ان پسماندہ علاقوں کی اپنے جائز حقوق کے لیے جاری جائز جدوجہد کو تسلیم کرنے سے انکار کرنے کا جواز فراہم کیا جائے۔ اگر ان غیر مراعات یافتہ گروہوں کے مطالبات کو دیکھا جائے تو واضح ہوگا کہ یہ مکمل طور پر لیگ کی

مذکورہ تحریکوں کے سیکولر ثقافتی تصور (idiom) کے عین مطابق ہیں۔

بنگال کی لسانی تحریک نے ۱۹۴۷ء میں اس وقت جنم لیا جب خود پاکستان کا اپنا قیام وجود میں آیا۔ اس تحریک کو اپنا پہلا شہید ۱۹۵۲ء میں اسی وقت ملا جب بنگالی زبان کو سرکاری حیثیت تسلیم کرنے کے لیے ایک عمومی ہڑتال کا اعلان کیا گیا جس کے نتیجے میں پورا مشرقی بنگال مکمل طور پر بند (Stand still) ہو گیا۔ اور صوبے کی تمام انتظامیہ کئی روز کے لیے مفلوج ہو کر رہ گئی۔ اس کے نتائج دو برس بعد ۱۹۵۴ء کے انتخابات کے نتائج کی صورت میں سامنے آئے جب حزب اختلاف کی جماعت یونائیٹڈ فرنٹ نے مکمل طور پر برتری حاصل کر لی اور حکمران مسلم لیگ کو ۳۰۹ نشستوں میں سے صرف ۱۰ نشستیں حاصل ہو سکیں۔ یہ بنگالی قوم پرستی کا وہ ماحول تھا جس سے عوامی لیگ ایک بڑی سیاسی جماعت کے طور پر ابھر کر سامنے آئی۔ بنگالی زبان کی اس تحریک کے کردار کا سب سے نمایاں پہلو یہ تھا کہ اپنے ابتدائی دنوں میں اس کی عوامی سطح کی بنیادیں بائیں بازو کے ہاتھوں میں تھی جو کہ انتہائی گھٹن (repression) کے ماحول میں گمنامی کے طور پر کام کر رہے تھے۔ انکو اپنی اس تحریک میں مشرقی بنگال کی حکمران سیاسی اشرافیہ کی کوئی مدد شامل نہ تھی جو کہ اس وقت غالب (dominant) پنجابی نوکر شاہی کی سرپرستی میں اختیار کے مزے لوٹ رہے تھی، جو کہ (پنجابی نوکر شاہی) خود پورے پاکستان پر اپنا سیاسی غلبہ قائم رکھے ہوئے تھی۔ بنگالی زبان کے لیے شروع کی گئی تحریک جو کہ احتجاجی تحریک تھی، کئی طرح سے اہمیت کی حامل تھی کیونکہ اس نے بالآخر بنگال قوم پرستی کی تحریک کی بنیاد ڈالنے میں مدد دی اور اس احتجاجی تحریک نے پوری بنگالی قوم میں انتہا پسند (radical) سیاسی شعور پیدا کیا۔ اس نے بنگالی لوگوں کے ذہنوں میں اتحاد کا شعور (Sense) پیدا کیا اور بطور غیر مراعات یافتہ سیاسی (underpriviliged) گروہ کے ایک شناخت بھی فراہم کی۔ اس کے لیے سب سے بڑی مدد اس پڑھے لکھے نچلے درمیانے طبقے نے مہیا کی جن میں عوامی لیگ کی سیاسی جڑیں

موجود تھیں۔لیکن تحریک نے سماجی انصاف کے نظریے کو ساتھ ملا کر کسانوں اور محنت کشوں کے حقوق کی بات کر کے ان کو بھی اپنی اس جدوجہد میں مکمل طور پر شریک کر لیا۔

بڑی ہچکچاہٹ کے ساتھ ہی سہی بحرحال حاوی پنجابی نوکر شاہی اشرافیہ کو بنگالیوں کے ان مطالبات کو کسی حد تک تسلیم کرنا پڑا جو کہ سرکاری ملازمتوں میں ان کی نمائندگی اور ملازمتوں میں ترقی کے یکساں مواقعوں کے متعلق تھا۔اس کے 'تسلیم' کیے جانے کے نتیجے کے طور پر بالآخر ساٹھ کی دہائی کے آخر تک صوبائی انتظامیہ کی اکثریت پر بنگالی سول ملازمین تعینات ہو چکے تھے۔لیکن مرکزی حکومت کی ملازمتوں پر بنگالیوں کی نمائندگی ابھی بھی بہت کم تھی۔۱۹۶۹ء میں یہ پہلی مرتبہ ہوا کہ چند بنگالیوں کو وفاقی وزارتوں میں سیکریٹری کے طور پر تعینات کیا گیا جو کہ پوری وزارت چلانے کے ذمہ دار تھے حدتو یہ ہے کہ اتنی دیر کے بعد یہ دی جانے والی رعایت(concession) کو غیر معمولی واقعہ (event) قرار دیا گیا اور اس کی قومی سطح پر بڑی تشہیر کی گئی اور اخبارات نے اس پر بڑے اداریے لکھے۔لیکن بجا طور پر بنگالویں نے شکایت یہ جاری رکھی کہ یہ علامتی خیر سگالی ناکافی ہے۔ یہ احتجاج صرف اس بنیاد پر نہ تھا کہ بنگالیوں کو اب بھی ان کی آبادی کے تناسب سے بہت کم نمائندگی دی گئی تھی لیکن یہ احتجاج اس وجہ سے بھی تھا کہ بنگالی وفاقی سیکریٹریوں کو جو وزارتیں دی گئیں تھیں وہ انتہائی غیر اہمیت کی حامل تھیں۔اصل اہمیت کی حامل وزارتیں مثلاً خزانہ، دفاع،منصوبہ بندی،اسٹبلشمنٹ وغیرہ اب بھی مغربی پاکستان نے اپنے انتہائی بااعتماد لوگوں کے ہاتھوں میں ہی رہنے دیں۔مشرقی بنگال میں شروع کی جانے والی فوجی کاروائی کے بعد ان بنگالی افسران کو بھی ان کے عہدوں سے الگ کر دیا گیا۔جبکہ دوسری طرف فوج میں بھرتی کے دوران بھی بنگالیوں کو بڑا احسان کرتے ہوئے انہیں اس بناء پر کچھ رعایتیں فراہم کی گئیں کہ مشرقی بنگال سے فوج کے 'معیار' کے مطابق بھرتی کے لیے افراد میسر نہیں۔مزید کہ ہندوستان سے طویل تنازع کی صورت میں بھی پاکستانی فوج کی اکثریت مغربی پاکستان

میں ہی تعینات ہی۔ ۱۹۶۵ء میں ہندوستان کے ساتھ لڑائی میں مشرقی پاکستان کو مکمل طور پر دفاع کے بغیر چھوڑ دیا گیا۔ اس کی بنیاد پر مشرقی بنگال کی طرف سے یہ مطالبہ سامنے آیا کہ مسلح افواج میں بنگالیوں کے لیے حصہ مختص کیا جائے۔ اس کے بعد بنگالیوں کی بھرتی کے عمل میں زیادہ تیزی دیکھنے کو بھی ملی۔ لیکن اس کے باوجود فوج میں بنگالی یونٹ بہت کم تھے اور نہ ہی ان کے پاس ضرورت کا اسلحہ اور نہ ہی مکمل تربیت تھی۔

بنگالیوں کی طرف سے مساویانہ رویے کے لیے تحریک پچاس کی دہائی کے اواخر میں ایک نئے مرحلے پر پہنچی اور یہ مطالبات سامنے آئے کہ مشرقی بنگال کو اس کی ترقی کے لیے مساوی بنیادوں پر مالی وسائل فراہم کیے جائیں۔ اس سلسلے میں مشرقی بنگال کے ماہرین اقتصادیات نے بلاشبہ اعلیٰ درجے کے تحقیقی کام اور کاوشوں سے اعداد و شمار اکٹھا کر کے یہ بات ثابت کی کہ مغربی پاکستان بڑی آہستگی سے مشرقی بنگال کے وسائل کا استحصال کر رہا ہے۔ انہوں نے اپنے اس عملی کام کے ذریعے مغربی پاکستان کے ہاتھوں بڑی مشرقی بنگال کے وسائل کا استحصال چابت کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے اس بات کے بھی ثبوت فراہم کئے جس کے ذریعے یہ بات ثابت کی کہ مشرقی بنگال سے وسائل مغربی پاکستان کی طرف منتقل کیے جاتے ہیں۔ ان کے یہ دلائل تھے کہ وسائل کی تقسیم اور اقتصادی منصوبہ بندی میں بڑی اہم اور فوری تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ یہ باتیں مشرقی بنگال کے مطالبات کی بنیاد بن گئے ۔ ان کے مطالبات بالکل جائز تھے اور اب انہیں تمام دنیا (universally) تسلیم کر رہی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ بھٹو بھی یہ کہنے پر مجبور ہوئے 'مشرقی بازو (یعنی بنگلہ دیش) کو ماضی میں ایک کالونی کے طور پر treat کیا گیا''۔ میں (راقم) نے اس سے قبل منصوبہ بندی کمیشن کے فراہم کردہ اعداد و شمار سے یہ بات واضح کی ہے کہ مشرقی بنگال میں وسائل مغربی پاکستان کے مقابلے میں بہت کم خرچ کیے گئے۔

اقتصادی ناہمواریوں اور یہ حقیقت ہے کہ مشرقی بنگال کی اقتصادی ترقی کافی حد تک

نظرانداز ہوتی رہی، اس کے پس پشت اس ملک میں موروث(inherent) کیے گئے سرمایہ دارانہ ترقی کے مختلف پہلو(dynamics) اور پاکستان کے حکمران طبقوں کی نجی ملکیت کے ساتھ نظریاتی وابستگی نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔نجی سرمایہ کاری میں مشرقی بنگال کا حصہ ۲۵ فیصد کے قریب ہے۔مزید کہ اس کا بھی بڑا حصہ 'مغربی پاکستان' کے کاروباری افراد کے ہاتھوں میں ہے۔پاکستان کی بورژواری زیادہ تر(mainly) دولسانی گروہوں پر مشتمل ہے۔ان میں سے زیادہ تر وہ گجراتی مسلمان ہیں جو کہ اصلاً ہندوستانی گجرات سے تعلق رکھتے ہیں اور پاکستان کے قیام کے وقت ہجرت کر کے پاکستان بالخصوص مغربی پاکستان کی طرف منتقل ہوئے۔جبکہ پاکستانی سرمایہ داروں کا ایک دوسرا گروہ پنجابیوں پر مشتمل ہے۔ان کی حرکات(activities) زیادہ تر مغربی پاکستان تک محدود ہیں۔ان کو فائدہ یہ ہوا کہ مغربی پاکستان میں ہونے والی ترقی سے یہ براہ راست مستفید ہوئے۔مغربی پاکستان جو کہ خوشحال زرعی اقتصادیات رکھتا ہے وہ ان کو نسبتاً امیر اور خوشحال منڈی فراہم کرتی ہے۔کچھ کاروباری افراد ہجرت کے وقت ہندوستان سے براہ راست مشرقی بنگال منتقل ہوئے تھے۔لیکن چونکہ انہیں بطور 'مغربی پاکستانی' شناخت کیا گیا اور پچاس کی دہائی میں بنگالی زبان کے لیے چلائی جانے والی تحریک میں ان کو حدف بنایا گیا اس لیے انہوں نے دلبرادشتہ ہو کر اپنا سرمایہ مغربی پاکستان منتقل کرنا شروع کر دیا۔لیکن 'بڑے سرمایہ دار' اس صورتحال کے باوجود مشرقی بنگال کے استحصال کرنے اور وہاں نجی سرمایہ کاری کرنے سے باز نہ رہے۔لیکن نجی سرمایہ کاری کا بنیادی محور مغربی پاکستان تک ہی محدود رہا۔مشرقی بنگال میں نجی سرمایہ کاری کا عمل، ایک بڑا مسئلہ ہی بنا رہا۔اس صورتحال میں مشرقی بنگال میں ترقی کا واحد راستہ سوشلسٹ نظام تھا۔اس لیے مشرقی بنگال میں سوشلسٹ نظریات نے بڑی حد تک مقبولیت بھی حاصل کر لی۔

۶۰ کی دہائی میں صدر ایوب نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مشرقی بنگال میں ایک بنگالی

بورژواری کو پروان چڑھائیں گے۔اس کا خیال تھا کہ یہ بورژواری ان کوصوبے میں ایک سیاسی بنیادفراہم کرے گی اورسوشلسٹ نظریات کے اثر کو کنارہ(Counter) کرے گی۔ اس کو اس منصوبے کیلیے مغربی پاکستان کی بورژواری کی مکمل تائید وحمایت حاصل تھی۔ بورژواری بنانے کے لیے حکومت کو ان لوگوں کو پیسہ فراہم کرنا تھا جن کے پاس یہ بہت کم تھا۔دواقسام کے لوگوں کو'سرمایہ دارانہ' تشکیل(formation) کے عمل میں شریک کیا گیا، جو کہ ایوب حکومت نے وضع کیا تھا۔ان دواقسام کو ہم 'ٹھیکہ دار'(contractor) اور تعلق دار(contacters) کہہ سکتے ہیں۔تعلق داران پڑھے لکھے بنگالیوں پر مشتمل گروہ تھا جو کہ بااثر تعلقات(influncial contacts) رکھتے تھے(خاص طور پر وہ لوگ جو نوکر شاہی یا سیاست دانوں کے رشتہ دار تھے)انہیں ہر قسم کے پرمٹ اور لائسنس جاری کیے گئے۔ان پرمٹوں کی نقد قیمت(value) تھی اور ان کو مغربی پاکستان کے ان کاروباری حضرات کو بآسانی فروخت کیے جاسکتے تھے جو کہ ان کے حصول کے خواہش مند تھے اور اس سے وہ باآسانی منافع کما سکتے تھے۔اس عمل کے نتیجے میں عام خریداری کی قیمت پر جیسے اشیاءگراں نرخوں پر خریدنا پڑیں۔دولت منتقل ہوکر اس مفت خوری(parasitic) کلاس کے جیبوں میں چلی گئی۔انہوں نے بڑی شاہانہ طرز زندگی اپنالی اور کئی نے تو اپنی صنعتیں بھی قائم کرڈالیں۔ٹھیکیداران سے مختلف تھے۔یہ چھوٹے کاروباری حضرات تھے جنہیں حکومت نے تعمیر وغیرہ کے ٹھیکے بڑے مہنگے نرخوں پر دیئے۔ان ٹھیکوں سے کمائے جانے والے منافعوں کو دوبارہ کاروبار میں لگایا گیا۔بعدازاں ان کی صنعتکار بننے کے عمل میں حوصلہ افزائی کی گئی۔اس مقصد کے لیے سرکاری مدد اور فراخدلانہ قرضے بھی مہیا کیے گئے۔مثلاً کئی صنعتی منصوبوں کے لیے پاکستان کا صنعتی بینک (The Industrial Bank of Pakistan)(جو کہ اس مقد کے لیے ہی قائم کیا گیا تھا) نے دوتہائی(two third) قرضے جاری کیے جبکہ بقیہ کل رقم کا تیسرا حصہ مشرقی پاکستان کے صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

نے مہیا کیے جبکہ بقیہ چھٹا(Sixth) حصہ خواہش مند صنعتکار کو خود اپنی طرف سے لگانا تھا یا پھر اس کا اسٹاک ایکسچینج کے ذریعے انتظام کرنا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس رقم کا بھی بڑا حصہ حکومت کے بنائے گئے دیگر داروں مثلاً قومی سرمایہ کاری ٹرسٹ (National Investmen Trust) اور سرمایہ کاری کارپوریشن نے ہی فراہم کیے۔ اس طرح ایک صنعت کو قائم کرنے کے لیے ایک خواہش مند بنگالی صنعت کار کو صرف ۱۰ فیصد سرمائے کی ضرورت تھی۔ لیکن اس عمل میں منافع اس قدر زیادہ تھا کہ انہیں ان صنعتوں کا کلی (sole) مالک بننے میں کوئی زیادہ عرصہ نہ لگا اور ان صنعتوں نے ان کے لیے بہت جلد خوش نصیبی کے نئے دریچے کھول دیئے۔

اس صنعتی عمل کے نتیجے میں ابھر کر سامنے آنے والی بنگالی بورژواری کا رویہ بنگالی قوم پرستی کے لیے مکمل حمایت کا تھا۔ انہوں نے یہ منافع کمایا ہی اس دباؤ کی وجہ سے تھا جو کہ قوم پرستی کی اس سیاست نے پیدا کیا تھا۔ لیکن وہ اس قسم کی سیاست سے اس کے بائیں بازو کی طرف جھکاؤ کے باعث خوف زدہ بھی تھے۔ انہیں اس بات کا بھی علم تھا کہ انہوں نے اس عمل سے جو بے تحاشہ منافع کمایا ہے اس کے تحفظ کے لیے ایک مرکزی حکومت موجود ہے اور اس پر وقتاً فوقتاً دباؤ ڈال کر مزید فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں لیکن ایک آزاد مشرقی بنگال میں صورتحال ان کے لیے کسی حد تک مشکل ہو سکتی تھی۔ اس لیے پوری بنگالی بورژواری نے کلی طور پر اس قوم پرست تحریک کی مکمل حمایت نہ کی۔ کچھ نے تو مشرقی پاکستان کی دائیں بازو کی تحریکوں کی حمایت کی اور کچھ نے حکمران oligrachy کے ساتھ اپنا تعاون (collaboration) جاری رکھا۔ وہ خاص طور پر ۶۹۔۱۹۶۸ء کے موسم سرما میں شروع ہونے والی تحریک سے بڑی حد تک دلبرداشتہ (Domolarized) ہو گئے جب اس تحریک کے نتیجے میں ایوب حکومت کے خلاف ملک بھر میں احتجاج ہوئے اور بالآخر اس کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن احتجاج کا رویہ دیکھتے ہوئے یہ امکان پیدا ہونے لگا کہ یہ

انقلابی تحریک میں تبدیلی ہوسکتی تھی خصوصاً مشرقی بنگال کی حدتک تو ممکن تھا۔ان میں سے کئی نے تو اپنا سرمایہ سیاسی طور پر نسبتاً زیادہ مستحکم مغربی پاکستان یا پھر غیر قانونی طور پر دیگر ممالک کو منتقل کرنا شروع کر دیا۔ایک طرف جہاں یہ مزید علاقائی خودمختاری اور وسائل کی منصفانہ تقسیم کا مطالبہ کرتے آئے تھے وہیں یہ مغربی پاکستان کی نوکر شاہی فوجیoligrachy کو اپنے مفادات کا سب سے بڑا محافظ بھی تصور کرتے تھے۔اس لیے مشرقی بنگال کی آزادی کی تحریک میں بنگالی بورژواری کے کردار کی وضاحت کیے بغیر اسے سمجھانا ناممکن ہوگا۔مزید یہ کہ اس تحریک کی کلی طبقاتی بنیادوں کو دیکھتے ہوئے ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ یہ تحریک بورژواری کلاس کے شامل ہونے سے قبل ہی بڑی کامیابی حاصل کر چکی تھی۔لیکن یہی بات کہی جائے گی کہ اس تحریک کی طبقاتی بنیادیں، بنیادی طور پر پیٹی بورژواری میں ہی ہیں۔ لیکن مسلح آزادی کی جدوجہد نے اس کو عوامی جدوجہد میں تبدیل کر دیا ہے۔

مشرقی بنگال کے مطالبات پر مغربی پاکستان کے مختلف طبقات ، نئے نوآبادیاتی مفادات(neo-colonial interests) اور نوکرشاہی۔فوج (oligarchy) کے درمیان کسی بھی قسم کی یکساں ہم آہنگی نہ تھی۔سب سے پہلے تو مغربی پاکستان کے جاگیرداروں کو مشرقی بنگال کو پاکستان کے وفاق میں برقرار رکھنے سے بہت ہی کم فوائد کی امید تھی لیکن ان کا نقصان کافی زیادہ تھا۔مغربی بنگال نے جس طرح ریڈیکل (انتہا پسند) سیاسی رویوں کو آگے بڑھایا تھا یہ صورتحال براہ راست مغربی پاکستان کے جاگیرداروں کے مفادات سے ٹکراتی تھی۔ایک خاص خطرہ جو کہ ان جاگیرداروں کو مشرقی بنگال سے لاحق تھا وہ مشرقی بنگال کا زرعی آمدنی پر ٹیکسوں کا عائد کرنے کا مطالبہ تھا۔یہ آمدنی اب تک ٹیکس سے مستثنیٰ تھی۔یہ ٹیکس اس لیے بھی ضروری تھا کہ کیونکہ اس کے بغیر چوتھے پنج سالہ منصوبے کے لیے مختص کی گئی رقم کی فراہمی ممکن نہ تھی۔اس رقم کی عدم فراہمی کی صورت میں پہلے سے ہی پسماندگی کے شکار مشرقی بنگال کے لیے ترقیاتی رقم کی فراہم نہیں کی جاسکتی تھی۔مزید یہ

کہ مشرقی بنگال میں نسبتاً چھوٹی زمینداری ہونے کے باعث وہ اس عائد ٹیکس سے زیادہ متاثر نہ ہوتے بلکہ اس کا براہ راست اثر مغربی پاکستان کے بڑے جاگیرداروں پر پڑتا۔ بہرحال یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ مغربی پاکستان کے زمینداروں کو اس مسئلے پر آگاہی دینے کے لیے کسی بحث ومباحثے یا غوروفکر کا کوئی سلسلہ شروع کیا گیا تاکہ انہیں اپنے ذاتی مفادات سے بالاتر کر کے انہیں قومی اور محبّ وطن احساسات کے تابع لا کر ٹیکس کی ادائیگی کے لیے آمادہ کیا جاسکتا۔ لیکن ان میں ایک ایسا طاقتور اور مضبوط گروہ بھی موجود تھا جو کہ علاقائی خود مختاری (جس کا بنگالی مطالبہ کر رہے تھے) کا حامی تھا تاکہ اس کے ذریعے سے اپنی مراعات کو بھی حاصل کیا جاسکے۔

مشرقی بنگال کو پاکستان میں شامل رکھنے کا سب سے زیادہ فائدہ مغربی پاکستان کی بورژواری کو تھا۔ کیونکہ مشرقی بنگال کی صورت میں انہیں اپنی مصنوعات کو مہنگی قیمتوں پر فروخت کرنے کے لیے ایک محفوظ اور مستحکم منڈی موجود تھی اور اس سے کثیر زرمبادلہ (Foreing Exchange) کمایا جاسکتا تھا۔ لیکن انہوں نے عوامی لیگ کی زیر قیادت علاقائی خودمختاری کے مسئلے پر اس سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ کیونکہ ان کے مفادات کو علاقائی خود مختاری کی وجہ سے کوئی خاص نقصان پہنچنے کا احتمال نہ تھا۔ جہاں تک سرمایہ کاری کا سوال ہے تو وہ اس میں بالکل عدم دلچسپی رکھتے تھے۔ اسکی ایک وجہ تو وہ سیاسی جوکھم بھی تھا جو کہ ان کو مشرقی بنگال میں لاحق تھا لیکن اس کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ مغربی پاکستان میں سبز انقلاب کے بعد ان بڑے جاگیرداروں کی زرعی آمدنی اس قدر بڑھ چکی تھی اور ان کو اتنا کثیر منافع حاصل ہو رہا تھا کہ انہیں کہیں اور جانے کی ضرورت ہی نہ تھی اور یہاں استحصال کرنا بھی نسبتاً سہل تھا۔ مشرقی بنگال میں ان کے مفادات کم سے کمتر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ وہ مشرقی بنگال میں آنے والے متوقع انقلاب سے شدید پریشان تھے۔ اور خصوصاً ۶۹۔۱۹۶۸ء کے موسم سرما کے تجربے نے ان کے خوف کو مزید بڑھا دیا تھا۔ اس لیے ان

کے لیے محفوظ راستہ یہی تھا کہ وہ عوامی لیگ جیسی دقیانوسی (conservative) قوت کی حمایت کریں جیسا کہ امریکہ اور دیگر مغربی قوتوں نے بھی کیا۔ انہوں نے عوامی لیگ کو کثیر مالی مدد بھی فراہم کی۔ انہیں اس بات کا بھی بھرپور احساس تھا کہ عوامی لیگ کی قیادت کو کس قسم کے عوامی دباؤ کا سامنا تھا۔ اس لیے معاملات پر عوامی لیگ کی گرفت برقرار رکھنے کے لیے اپنے کچھ مفادات کی قربانی دینے کے لیے بھی تیار ہو گئے تا کہ ان انقلابی قوتوں کو آگے بڑھنے سے روکا جا سکے جو کہ مشرقی بنگال کے لیے حقیقی خطرہ تھے۔ انہوں نے عوامی لیگ کے دیئے گئے علاقائی خودمختاری کے منصوبے کی مکمل حمایت کی یقین دہانی کرائی کیونکہ اس سے ان کے مفادات پر کوئی ضرب نہیں پڑتی تھی۔ وہ فوجی کاروائی کے بجائے عوامی لیگ کے ساتھ کسی بھی معاہدے کو ترجیح دیتے کیونکہ اس صورت میں اس بے تحاشہ اور بڑے نقصان سے محفوظ رہا جا سکتا تھا جو کہ فوجی کاروائی سے ہو سکتا تھا۔

امریکہ کی زیر قیادت نئی نوآبادیاتی طاقتیں (neo-colonial powers) مشرقی بنگال میں علاقائی خودمختاری کو روکنے میں بہت کم دلچسپی رکھتی تھیں۔ جبکہ اس کے برعکس امریکی مشرقی بنگالیوں کی علیحدگی پسندگی کی تحریک میں نہ صرف کلی طور پر ملوث (involve) رہے ہیں بلکہ وہ اس کی حوصلہ افزائی اور اس کی حمایت بھی کرتے رہے ہیں اور انہوں نے اس میں مداخلت (infiltration) بھی کی۔ عوامی لیگ کی قیادت میں بنگلہ دیش کی بننے والی حکومت کسی بھی صورت میں کوئی انقلابی اقدامات اٹھانے کی حیثیت میں نہیں ہوگی اور کمزور بورژوای اور نجی کاروبار کی ناپید بنیادوں کے باعث وہ مکمل طور پر امریکہ پر انحصار کرنے پر مجبور ہوگی۔ اسی لیے امریکی حکومت اور دیگر مغربی قوتیں پاکستان پر اقتصادی اور سفارتی دباؤ ڈال رہی ہیں تا کہ وہ مشرقی بنگال سے مغربی پاکستان کی افواج کو نکال باہر کرے۔

مشرقی پاکستان کے لوگوں کے خلاف فوجی کاروائی کے لیے سب سے زیادہ

زور (thrust) نوکرشاہی فوجی (oligarchy) کی طرف سے ڈالا جارہا ہے۔لیکن یہاں بھی صورتحال کچھ گھمبیر ہےاوراس کی وجہ نوکرشاہی کے رویے میں تبدیلی ہے جس کے پس پشت حالیہ تبدیلیاں ہیں۔ غالب (dominated) پنجابی نوکرشاہی (oligarchy) کو آہستگی سے ترقی پسند بنگالی مطالبات کے آگے سرتسلیم خم کرنا پڑا۔ پنجابی افسران پر اس قدم کا کوئی اثر نہ پڑا جب علاقائی تحریکوں کے دباؤ کے نتیجے میں ہی صحیح بہرحال بنگالی افسران کو ترقی دے کر انہیں اعلی (سینئر) مقامات پر تعیناتیاں دی گئیں۔ ان ترقیوں کا مقصد اعلی عہدوں پر مختلف علاقوں سے تعینات افسران کے درمیان مناسب توازن پیدا کرنا تھا۔لیکن پنجابی نوکرشاہی اشرافیہ نے اس عمل سے یہ سمجھا کہ ان کے ساتھ ان کی اپنی سینیارٹی پر دغا بازی (cheat) کیا گیا ہے۔ اسی طرح وسائل پر علاقائی حق کو تسلیم کرنے سے بھی یہ خیال آگے بڑھا کہ بیشتر وسائل پر ان کا کنٹرول بھی کم ہوتا جائے گا۔ اس صورتحال میں کافی افسران نے شاید اس فوجی کاروائی کی حمایت کی۔لیکن ان سب نے ایسا نہیں کیا اس لیے انہیں اب اس بات کا احساس ہوگیا کہ اس کاروائی کے نتیجے میں بہت زیادہ مالی نقصان ہوا ہے(انسانی جانوں کے نقصان کی شاید فکر نہ ہو) اس لیے اب وہ مشرقی بنگال سے فوج کی واپسی کے مطالبے پر راضی ہوجائیں گے۔

یہ فوج ہی تھی جو کہ مشرقی بنگال میں اٹھنے والی علاقائی خودمختاری کے مطالبے کے باعث سب سے زیادہ خطرے کا شکار تھی۔ عوامی لیگ کے چھ نکات کو تسلیم کر لینے کا واضح مطلب یہ تھا کہ مرکز سے (جو کہ ملکی دفاع کا ذمہ دار ہے) وسائل لے کر صوبوں کو دیئے جائیں اس طرح وسائل پر حق اب مرکز کے بجائے صوبوں کا ہوگا۔ اسی طرح عوامی لیگ مالی کنٹرول اور اقتصادی فیصلہ سازی کے عمل کو غیر مرکزیت (decentralized) کرنے میں دلچسپی رکھتی ہے۔ اس کا یہ بھی منصوبہ ہے کہ ملکی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ دفاعی بجٹ کو کم کیا جائے تاکہ ترقیاتی منصوبوں کے لیے فنڈز کی فراہمی کو یقینی بنایا جاسکے۔ یہ منصوبہ فوج

کے مفادات پر براہ راست کاری ضرب کے مترادف تھا۔

فوج کو اپنے مفادات کے خطرے میں نظر آنے کے تصور کو مزید تقویت فوج کی اس نظریاتی آ گہی (orientation) سے بھی ملی جس کے تحت فوجی افسران میں انڈیا مخالف شاؤنزم کو ہمیشہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس نظریے کے تحت اس خیال کو مزید بڑھاوا دیا گیا کہ بنگالی تحریک بھارت سے متاثر ہے، بھارت اس کو مالی مدد فراہم کر رہا ہے اور بھارت ہی نے اس تحریک کو انجینئر (engineered) کیا ہے تا کہ پاکستان کے اتحاد کو توڑا جا سکے۔ پاکستانی فوج کی تربیت ہی اس طرح کی جاتی ہے کہ انہیں یہ احساس دلایا جائے کہ ان کا اصل دشمن انڈیا ہے اور انہوں نے اسی سے دفاع کرنا ہے۔ دائیں بازو کے نظریہ سازاس کو مزید ہوا دیتے ہوئے یہ کہتے رہے کہ بنگالی قوم پرستی کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ یہ انڈیا کی غلامی کے مترادف ہے۔ اس کے برعکس بنگالی قوم پرستوں نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے لیے مغربی پاکستان میں کوئی سنجیدہ کوشش اور پروپیگنڈہ نہیں کیا۔ سوائے چند اقتصادی مطالبات کہ جو بھی صرف انگریزی زبان کی پریس میں شائع ہوتے رہے۔ بنگالیوں کا ایک اہم مطالبہ بنگالی زبان کو نافذ کرنے کا تھا اور یہ مطالبہ صرف مغربی پاکستان کی دیگر زبانوں کو مسترد کرنے کا نہیں تھا بلکہ انگریزی کو بھی بدلنے کا تھا، جو کہ پاکستان کے پڑھے لکھے طبقے کے درمیان رابطہ کاری کا کام کرتی تھی۔ بنگالی تحریک کا تحریری مواد (literature) آج بھی ان لوگوں کی پہنچ سے باہر ہے جو کہ بنگالی زبان سے آشنا نہیں۔ بنگالی قوم پرستوں کی ایک ناکامی یہ ہے کہ انہوں نے مغربی پاکستان کے ساتھ ابلاغ عامہ (communication) کا رشتہ برقرار نہ رکھا جس کی وجہ سے وہ تنہائی کا شکار ہو گئے اور مغربی پاکستان میں ان کے نقطہ نظر کا درست طریقے سے نہ پہنچنے کے باعث ان کے لیے وہاں غلط پروپیگنڈہ کیا جاتا رہا اور وہاں بنگالیوں کے لیے مخاصمت (hostility) کا ماحول بن گیا۔ یہ مخاصمت (hostility) مغربی پاکستان میں سرائیت کر چکی ہے اور اس کا

اظہار پاکستان پیپلز پارٹی کے نظریات اور بھٹو کے رویے سے بھی ہوتا ہے جو کہ فوج کے انتہا پسندوں (hawks) کے بہت زیادہ نزدیک ہیں۔ دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں پنجاب اور سندھ میں پی پی پی کی کامیابی نے ان انتہا پسندوں کے ہاتھ مزید مضبوط کر دیئے۔

ہمارے تجزیے سے دو نتائج سامنے آتے ہیں۔ پہلا تو نوآبادیات کے خاتمے کے بعد کے معاشروں میں پڑھے لکھے درمیانے درجے کے سیاسی کردار پر زور ڈالتا ہے۔ یقیناً ان کی خواہش نوکر شاہی فوجی oligarchy میں کوئی مقام حاصل کرنا ہوتا ہے جو کہ ایسے معاشروں میں غالب (dominant) مقام کی حامل ہوتی ہے۔ 'قومی' اتحاد کے نظریہ کو اس oligarchy کے مراعات یافتہ گروہ آگے بڑھاتے ہیں تاکہ اپنی مراعات یافتہ شناخت کو پوشیدہ رکھ سکیں۔ جبکہ دوسری طرف غیر مراعات یافتہ گروہ اپنے مطالبات کو علاقائی ثقافت یا لسانی یا ethnic شناخت کے idiom پر سامنے لاتے ہیں۔ ان مطالبات کی ضرورت معاشی ناہمواری (disparities) کی وجہ سے زیادہ پُرزور (reinforced) ہو جاتی ہے۔ یہ صورتحال سرمایہ دارانہ ترقی کی ناہمواریوں کا ضروری نتیجہ ہے۔ غیر مراعات یافتہ علاقائی گروہوں کی طرف سے لسانی اور ثقافتی شناخت پر زیادہ زور ڈالنے کے باعث اقتصادی ناہمواری (disparity) کا اصل سبب پس پشت چلا جاتا ہے۔ اس طرح غیر مراعات یافتہ علاقوں کی محرومیاں (frustration) اور توانائیاں سوشلسٹ انقلابی تبدیلیوں کے بجائے 'قومی' تحریکوں کی صورت میں سامنے آنے لگتی ہیں۔ علاقائی مطالبات کو تسلیم کیے جانے کے باوجود اور رعایتیں (Concession) دینے کے باوجود بھی سرمایہ دارانہ ترقی کا ڈھانچہ اندرون خانہ (underlying) برقرار رہتا ہے۔ اس لیے علاقائی گروہوں کے مسائل علاقائی خودمختاری کے حصول کے باوجود حل نہیں ہو سکتے۔ ان کے مسائل کا حل صرف سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے ہی ممکن ہے جو ایک ایسی صورتحال کو جنم دے جس کے ذریعے سرمایہ دارنہ نظام کی پیدا کردہ ناہمواریوں کا خاتمہ ہو سکے۔ دوسرا یہ کہ

مشرقی بنگال کے مخصوص حالات نے ایک ایسی صورتحال کو جنم دیا ہے جسے سادہ الفاظ میں صرف ایک علاقائی مسئلہ قرار نہیں دیا جاسکتا جس طرح کہ مغربی پاکستان کے دیگر غیر مراعات یافتہ علاقے مغربی پاکستان کے لیے بھی مسئلہ کا حل سوشلسٹ مغربی پاکستان کے لیے مشترکہ جدوجہد میں ہے نہ کہ سرمایہ دارانہ مغربی پاکستان میں علاقائی خودمختاری کے لیے محدود جدوجہد، مشرقی بنگال کے معاملے میں بہرحال ایک جداگانہ قومی شناخت ایک واضح صورت اختیار کرچکی ہے۔

یہ شناخت فوجی قتل عام اور بعدازاں شروع ہونے والی مسلح جدوجہد کے نتیجے میں انتہائی مستحکم (baptised) ہوچکی ہے۔ اس لیے ان حالات میں اس بات کا اب کوئی سوال ہی نہیں رہ جاتا کہ مشرقی پاکستان اب 'دوبارہ' مغربی پاکستان کے ساتھ 'متحد' ہوجائے۔ کم ازکم ان حالات تک جن میں نوکرشاہی فوجی oligrachy اس ملک پر حکمرانی کررہی ہے۔ کم ازکم اس تحریر کے لکھے جانے تک یہ انتہائی مشکل ہے کہ یہ بات کہی جائے کہ بالآخر کب اور کس طرح یہ موجودہ مسئلہ ایک آزاد بنگلہ دیش قائم ہوجانے کی صورت میں حل ہوگا۔ لیکن سوشلسٹ ہر طرف سے بنگلہ دیش کے لوگوں کی جدوجہد کی حمایت کریں گے اور مغربی قوتوں کی طرف سے اس کی آزادی کو روکنے کی سازشوں کو ناکام کردیں گے۔

Notes

۱۔ مشرقی بنگال کو سرکاری طور مشرقی پاکستان کا نام دیا گیا ہے لیکن بنگال قوم پرست اس کو بنگالی نام بنگلہ دیش سے بلاتے ہیں اور اسی نام سے اس کی آزادی کی تحریک چلائی جارہی ہے۔

۲۔ عوامی لیگ کا ۶ نکاتی ایجنڈا کچھ اس طرح تھا (۱) ایک وفاقی پارلیمانی نظام بمعہ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر (۲) وفاقی حکومت کے پاس صرف یہ شعبے ہوں یعنی دفاع، خارجہ اور کرنسی (۳) مشرقی اور مغربی پاکستان کے لیے دو جدا کرنسیوں کا نظام اور اس کے کنٹرول کے لیے دو جدا مرکزی بینک جو کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان سرمایہ کی حرکت (movemnents) کو کنٹرول کر سکے۔ (۴) مالیاتی پالیسی کو چلانے (regulate) اور ٹیکسوں کے نفاذ کی طاقت کی وفاقی اکائیوں کو منتقلی (۵) زرمبادلہ (Forieng exchange) کے لیے جداگانہ اکاؤنٹنگ اور بیرونی امداد کے لیے وفاقی اکائیوں کو انفرادی طو پر مذاکرات کا اختیار دینا (۶) وفاقی اکائیوں کو اس بات کی اجازت دینا کہ وہ اپنی سطح پر نیم فوجی دستے (para-military forces) رکھ سکیں۔

3- E. Mason. R. Dorfman, and S. Margolin, "*Conflict in East Pakistan- Background and Prospects*" (mimeographed) April 1971.

4- See: Hamza Alavi, "The Army and the

Bureaucracy in Pakistan Politics" in "*Arme'e Et Nation Duns Les Trois Continents"* (Ed.) Anouar Abdel-malek (forthcoming)

5- Paul Baran *"The Political Economy Growth"*, New York, 1957, pp. 220-1.

٦۔ اس صورتحال کا میں نے اپنے ایک آرٹیکل بعنوان "Imperialism: Old and New" میں لیا ہے جو کہ Socialist Register میں ستمبر ۱۹۶۴ میں شائع ہوا۔ اس مقصد کے لئے ضروری معلومات مائیکل کریدان کی کتاب "Foreign Investments in India" سے حاصل کی گئیں۔ اس سلسلے میں مزید یہ کہ یہ اس کتاب پر پیرا تبصرہ جو کہ New Left Review ۳۷، جون ۱۹۶۶ میں شائع ہوا۔

☆.....☆.....☆

سرمایہ داری کی ابتداء

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ میں تاجروں کا اہم کردار رہا ہے۔ تاریخ کے ابتدائی زمانے سے یہ لوگ اپنا سامان تجارت لے کر دوسرے ملکوں اور علاقوں میں جاتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب ذرائع نقل وحمل ابتدائی دور میں تھے۔ راستے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا، ڈاکوؤں اور وحشی قبائل کی لوٹ مار کا خطرہ بھی ہوتا تھا، مگر ان تمام مشکلات کو منافع کے جذبہ کے تحت برداشت کیا جاتا تھا۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ ان کا منافع سونے کی شکل میں ہو۔ جو ان کی دولت کو محفوظ رکھے۔ اس لئے عہد قدیم، اور عہد وسطیٰ میں سونے کی اہمیت بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ تاجر اور قومیں سونا جمع کر کے اپنی دولت اور طاقت میں اضافہ کرتی تھیں۔ کولمبس کہا کرتا تھا کہ سونا ایک ایسی قیمتی چیز ہے کہ جس کی مدد سے جنت کو بھی خریدا جاسکتا ہے۔

سرمایہ داری کے اس نظام کو عہد وسطیٰ میں مرکنٹائل، کیپٹل ازم کہا جاتا تھا۔ اس میں تاجر ایک جگہ سے سستا مال خرید کر دوسری جگہ مہنگے داموں فروخت کر کے منافع کمایا کرتے تھے، مثلاً عہد وسطیٰ میں جب یورپی تاجر ہندوستان میں آئے تو ان کے پاس تو یورپ سے لا کر فروخت کرنے والا کوئی سامان نہیں تھا، یہاں سے یہ کپڑا، مسالے اور نیل خریدتے تھے اور چاندی کی شکل میں اس کی قیمت ادا کرتے تھے مگر جب انگلستان میں صنعتی انقلاب آیا، تو

اس نے سرمایہ داری کی شکل بدل ڈالی اور انڈسٹریل کیپٹل ازم نے پہلے انگلستان میں سیاسی وسماجی تبدیلیاں کیں اور پھر یورپ کے دوسرے ملکوں میں اس کے اثرات ہوئے۔اب یہ اپنا مال فیکٹریوں میں تیار کر کے دوسرے ملک کی منڈیوں میں فروخت کے لئے بھیجتے تھے، اور اس سے منافع کماتے تھے۔

صنعتی انقلاب نے جہاں ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام کو پیدا کیا، وہیں اس نے معاشرے میں سرمایہ دار اور مزدور دو طبقوں کو تشکیل کیا۔اس طبقاتی تقسیم نے معاشرے میں معاشی اور سماجی ناہمواری اور غیر مساویانہ روایت کو آگے بڑھایا۔ اس ابتدائی دور میں فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔18 یا 19 گھنٹے کام کرنا ہوتا تھا، ان میں عورتیں اور بچے بھی ہوا کرتے تھے۔مزدوروں کی بستیوں میں نہ تازہ ہوا اور صاف پانی کی سہولت تھی، نہ گندے پانی کے نکاس کا کوئی ذریعہ تھا۔کام کی زیادتی، غذا کی کمی، اور ماحول کی وجہ سے یہ بیمار اور نحیف لوگ جلد ہی زندگی کی بازی ہار جاتے تھے۔

لہٰذا صنعتی انقلاب اور سرمایہ داری نے نئے نظریات اور خیالات کو پیدا کیا۔ان میں وہ فلسفی، مفکر اور سماجیات کے ماہرین تھے جو اس نظام کی حمایت کرتے ہوئے، اس کی بنیادوں کو مضبوط اور مستحکم بنانا چاہتے تھے۔دوسری جانب صاحب علم تھے جو اس کی خرابیوں سے لوگوں میں آگہی اور شعور پیدا کرنا چاہتے تھے۔

سرمایہ داری کی حمایت میں سب سے اہم نام آدم اسمتھ (Adam Smith) کا ہے کہ جس نے اپنی کتاب ویلتھ آف نیشن (Wealth of Nation) میں اس نظام کے خدوخال کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔

آدم سمتھ اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا تھا، اور تعلیم کے حصول کے بعد یہ گلاسکو یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوا۔کہا جاتا ہے کہ اسے ایک امیر نے زیادہ تنخواہ پر اپنے بیٹے کا استاد ہونے کی دعوت دی، جو اس نے قبول کر لی، اس وقت دستور یہ تھا کہ طالب علم براہ راست

استاد کو فیس ادا کرتے تھے چونکہ یہ وقت سے پہلے ملازمت چھوڑ رہا تھا، اس لئے اس نے طلباء سے کہا کہ وہ ان کی آدھی فیس واپس کرنا چاہتا ہے۔ اس پر طلباء نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں کیونکہ اس نے انہیں اب تک جو پڑھایا ہے، اس سے ان کی فیس وصول ہوگئی۔

امیر کی ملازمت کے دوران اس نے یورپ کی سیاحت کی، اور خاص طور سے فرانس میں وہاں کے معیشت دانوں سے ملاقاتیں ہوئیں، اور معیشت کے بارے میں ان کے نظریات سے آگہی ہوئی۔ یہ لوگ فری مارکیٹ کے حامی تھے کہ جس میں ریاست کے عمل دخل کو رَد کرتے تھے۔ لہٰذا واپسی پر اس نے اپنی کتاب اوریجن آف ویلتھ آف نیشن لکھی، اس میں اس نے جن اہم امور پر بحث کی ہے وہ یہ ہیں:

1- تقسیم کار: اب تک یہ دستور تھا کہ ایک فرد اپنے پیشہ میں رہتے ہوئے سارے کام خود کرتا تھا، مثلاً موچی سارا جوتا خود تیار کرتا تھا، یا بڑھئی اکیلا میز اور کرسی بناتا تھا۔ آدم اسمتھ کا کہنا تھا کہ اگر کام کو تقسیم کر دیا جائے تو اس صورت میں پیداوار کی شرح بڑھ جائے گی۔ اس کی مثال دیتے ہوئے وہ پن بنانے کا ذکر کرتا ہے۔ اگر ایک آدمی صبح سے لے کر شام تک پنیں بنائے تو وہ زیادہ سے زیادہ 50 یا 60 پنیں بنائے گا۔ اگر پن بنانے کے کام کو تقسیم کر دیا جائے تو چھ یا سات آدمی یہ کام کریں، تو اس صورت میں پیداواری شرح ہزاروں تک پہنچ جائے گی۔ یہ تقسیم کار اب ہم فیکٹریوں میں دیکھتے ہیں کہ یہاں جوتا بنانے کی فیکٹری میں ایک چمڑا سیدھا کرتا ہے، دوسرا اسے کاٹتا ہے، تیسرا اس کے اوپر کا حصہ بناتا ہے چوتھا اس کا تلوا تیار کرتا ہے، یہاں تک کہ آخر میں یہ تمام حصے مکمل ہو جاتے ہیں، اور جوتا پالش کے بعد تیار ہو جاتا ہے، لہٰذا تقسیم کار کے نتیجہ میں پیداوار بڑھ جاتی ہے۔

2- اس کا دوسرا اصول یہ تھا کہ صنعت کے اس نظام میں ریاست کو دخل دینا نہیں چاہئے۔ تنخواہ کا مسئلہ ہو تو یہ صنعت کار اور مزدور مل کر طے کریں، ریاست اس سلسلہ میں کوئی قانون نہیں بنائے۔ مارکیٹ کو تجارت کے سلسلہ میں آزاد ہونا چاہئے۔ تحقیق کا تعلق اس پر ہو کہ ان کی مانگ کس قدر ہے اور کس قدر ان کی پیداوار ہے۔

3- سرمایہ داری میں آدم اسمتھ کے نظریہ کے مطابق، ذاتی فائدے کی اہمیت ہوتی ہے (Self interest) اس ذاتی غرض کے تحت افراد محنت سے کام کرتے ہیں، اور زیادہ سے زیادہ منافع کی کوشش کرتے ہیں۔

آدم اسمتھ نے اپنے ایک مضمون میں تقسیم کار کے منفی اثرات پر لکھتے ہوئے اس کا اظہار کیا کہ ایک فرد جب ایک ہی قسم کا کام کرتا ہے تو اس کے نتیجہ میں اس کے لئے یہ کام غیر دلچسپی کا باعث ہو جاتا ہے۔ وہ اسے بار بار دہراتا ہے، اور یہ کام بطور ایک مشین کے کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی تخلیقی صلاحیت اور ذہانت ختم ہو جاتی ہے اس میں کسی قسم کی نئی سوچ اور فکر پیدا نہیں ہوتی ہے۔

صنعتی دور کے دو اہم مفکرین مالتھوس اور ڈیوڈ ریکارڈو تھے۔ مالتھوس نے آبادی کے بارے میں اپنے نظریات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ معاشرے میں آبادی میں اضافہ جیومیٹری کی شکل میں ہے یعنی 2، 4، 8، 16، یہ تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے، جب کہ غذا کی پیداوار ریاضی کی شکل میں ہے، یعنی 1، 2، 3، 4، اس کی وجہ سے آبادی اور غذا کے تناسب میں بے انتہا فرق ہوتا جا رہا ہے، یہ فرق قحط، خشک سالی، وبا اور دوسری آفات سے ضرور کم ہوتا ہے، لیکن اس پر قابو پانا ضروری ہے۔

ڈیوڈ ریکارڈو (David Recardo) نے، سرمایہ دارانہ نظام کے استحکام کے لئے

تنخواہ کے فولادی قوانین (Iron Rules of Wages) کا نظریہ پیش کیا۔ اس کے نزدیک مزدوروں کا اتنی تنخواہ دینی چاہئے کہ جس سے ان کا گذارا ہو جائے۔ اگر ان کو زیادہ تنخواہ دی گئی تو یہ زیادہ بچے پیدا کر کے آبادی میں اضافہ کریں گے۔ ریکارڈو کے ان نظریات کو یورپ اور امریکہ کے صنعت کاروں نے خوش آمدید کہا، کیونکہ اس سے انہیں فائدہ تھا۔

سرمایہ داری کے ان خیالات کی مخالفت میں بھی دانشوروں اور مفکرین نے آواز اٹھائی، اور ان پر گہری تنقید کی۔

☆.....☆.....☆

صنعتی انقلاب اور ردِعمل

ڈاکٹر مبارک علی

جب انگلستان میں صنعتی انقلاب آیا، تو اس کے نتیجہ میں جہاں سماجی اور معاشی تبدیلیاں آئیں، وہیں اس نے ماحولیات کو بری طرح سے اثر انداز کیا۔ فیکٹریوں کے قیام کے بعد صنعتی شہروں کا ماحول بدل گیا۔ مشینوں کا شوروغل، مزدوروں کی کچی آبادیاں اور ان میں صفائی کی سہولتوں کی کمی، کوئلہ سے چلنے سے مشینوں کا دھواں، جس نے فضا کو آلودہ کر دیا۔ کوئلے کے دھویں کی وجہ سے شہر کی عمارتیں کالی ہوگئیں۔ اس کا اثر لوگوں کی صحت پر بھی ہوا۔ خاص طور سے مزدور طبقہ جو 18 سے 19 گھنٹے کام کرتا تھا، فیکٹریوں میں، حفظانِ صحت کے انتظامات نہیں تھے جو ان کی صحت کو متاثر کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں اینگلز نے جو خود مانچسٹر میں ایک کپڑے کی مِل کا مالک تھا، انگلستان کے مزدوروں کی حالت زار پر کتاب لکھی، (Condition of Working Class in England) اور مزدوروں کی زندگی کے بارے میں جو نقشہ کھینچا ہے وہ انتہائی دردناک ہے۔ فیکٹریوں میں عورتیں اور بچے بھی کام کرتے تھے۔ بچے چھ سال کی عمر میں کام پر لگا دیئے جاتے تھے، آلودہ ماحول اور خراب غذا کی وجہ سے یہ ابتدائی عمر سے بیمار ہو جاتے تھے۔ فیکٹریوں کے مالکین کی جانب سے نہ پنشن تھی، نہ حادثہ کی صورت میں علاج و معالجہ کی سہولت، اور نہ

بیروزگاری کی حالت میں کوئی سہارا، یہ ایک بھاری قیمت تھی جو مزدور اس انقلاب کی کامیابی کے لئے ادا کر رہے تھے جب کہ صنعت کار اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے منافع کمار ہے تھے اور اپنی دولت میں اضافہ کر رہے تھے۔ لہٰذا مزدور اور معاشرہ دونوں اس صنعتی انقلاب کی قیمت چکار ہے تھے۔

ان حالات میں صنعتی انقلاب کے خلاف دو رجحانات پیدا ہوئے۔ ایک رجحان کا اظہار دانشوروں، شاعروں، اور مفکرین کی جانب سے آیا۔ ان کی تنقید تھی کہ اس عمل نے ماحول کو آلودہ کر دیا ہے۔ صاف اور پاکیزہ فضا کو خراب کر دیا ہے۔ شہروں کو بدصورت اور مسخ کر دیا ہے۔ معاشرے کے سکون اور اطمینان کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ انہوں نے اس کا مقابلہ کرتے ہوئے اس زراعتی معاشرے کی تصویر کشی کی کہ جس میں کھیتوں کی بہار تھی، پھولوں کی خوشبو تھی پرندوں کی چہچہاہٹ تھی۔ لوگ اس ماحول میں سادہ زندگی گزارتے تھے اور صحت مند تھے۔ انسان اور فطرت کے درمیان گہرا رشتہ تھا۔ اس پُرسکون، خوبصورت، رومان پرور ماحول کو صنعتی عمل نے تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ اس لئے ان کی خواہش تھی کہ معاشرے کو ایک بار پھر ماضی کی طرف لوٹنا چاہئے اور فطرت کی خوبصورتی کو بحال کرنا چاہئے۔ فرد کی خوشی و مسرت کا تعلق، صنعتی عمل سے نہیں ہے بلکہ زراعتی معاشرے اور اس کے پُرامن ماحول سے ہے۔

صنعتی انقلاب کے بارے میں دوسرا ردِعمل سوشلسٹ نظریات رکھنے والوں کا تھا، جو اس پر تو متفق تھے کہ زمانہ جو آگے آ چکا ہے اسے واپس ماضی میں نہیں لوٹایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس صنعتی عمل نے جو امیر و غریب کے درمیان تفریق پیدا کی ہے، دولت کی غیر مساویانہ تقسیم کی ہے، مزدوروں کا استحصال کیا ہے، اس کو روکا جا سکتا ہے اور ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی جا سکتی ہے جس میں مزدوروں کے حقوق کی حفاظت ہو، ان کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کیا جائے، ان کی عزت و حرمت ہو، تاکہ صنعتی عمل سے جو

سرمایہ پیدا ہورہا ہے، اس میں سب برابر کے حصہ دار ہوں۔

اس تنقید پر صنعت کاروں کی دلیل یہ تھی کہ انہوں نے ترقی کی جانب ایک اہم قدم اٹھایا ہے۔ زراعتی معاشرے سے ملک کو صنعتی میں تبدیل کر کے پیداوار کے عمل کو تیز کیا ہے۔ فیکٹریوں میں بیروزگار لوگوں کو ملازمتیں مہیا کی ہیں، تجارت کو مرکنٹائل سرمایہ داری سے انڈسٹریل سرمایہ داری میں بدلا ہے، اس کے نتیجہ میں قومی دولت میں اضافہ ہوا ہے، اور ملک ترقی کررہا ہے۔

صنعتی انقلاب نے جس طرح مزدوروں کا استحصال کیا، دولت کی غیر مساوی تقسیم کے اصول کو اپنایا اور معاشرے میں سرمایہ دار اور مزدور طبقے کے درمیان فرق کو قائم کیا، ان کو دور کیا جاسکے۔

اس سلسلہ میں چند سوشلسٹ نظریات کے حامیوں نے اس نظام میں اصلاحات کو متعارف کرانے کی کوشش کی۔ ان میں روبرٹ اوون (Robert Oven) جو ایک انگریز تھا اس نے اسکاٹ لینڈ میں ایک ماڈل فیکٹری نیولونارک کے نام سے قائم کی۔ اس فیکٹری میں مزدوروں کے اوقات کم تھے، ماحول کو صاف ستھرا اور آلودگی سے پاک رکھا گیا تھا، مزدوروں کی رہائش فیکٹریوں کے احاطے میں تھی۔ ان کے بچوں کے لئے اسکول، اور کھیل کے میدان تھے، بیماری کی صورت میں علاج معالجہ کی سہولت تھی۔ روزمرہ کی اشیاء کی خریداری کے لئے کوآپریٹو سٹورز تھے۔ اس ماحول میں مزدوروں نے زیادہ محنت اور دلچسپی سے کام کیا اور فیکٹری کی پیداوار دوسری فیکٹریوں کے مقابلہ میں زیادہ کی۔ روبرٹ اوون نے اپنی اس ماڈل فیکٹری کی تشہیر اور تبلیغ کے لئے برطانوی پارلیمنٹ سے رجوع کیا اور کوشش کی کہ برطانوی ریاست اس ماڈل کو قبول کر کے دوسری فیکٹریوں کو اسی منصوبے کی بنیاد پر چلائے۔ مگر اس میں اسے ناکامی ہوئی، اور اس کا یہ منصوبہ انگلستان میں اس لئے کامیاب نہیں ہوسکا کہ دوسرے صنعت کاروں نے اس کی مخالفت کی۔ انگلستان سے مایوس ہوکر

روبرٹ اوون نے امریکہ ریاست انڈیانا میں ہارمنی (Harmany) کے نام سے اپنی ماڈل فیکٹری قائم کی۔مگر جب وہ واپس انگلستان آیا تو اس کی غیر موجودگی میں یہ فیکٹری بھی زیادہ عرصہ نہیں چل سکی اور بند ہوگئی۔

فرانس کے دو سوشلسٹوں نے صنعتی انقلاب میں اصلاح کے لئے جو نظریات دیئے ان میں سے ایک سیس سائموں (Saint Simon) تھا، اگر چہ اس کا تعلق فرانس کے امراء کے طبقے سے تھا، مگر اس کی ہمدردی مزدوروں کے ساتھ تھی۔اس کے نظریات کے مطابق حکومت اور اس کے اداروں کو چلانے کے لئے امراء اور مذہبی طبقے کے لوگوں کو بالکل خارج کر دیا جائے، اور حکومت کے اختیارات ٹیکنو کریٹس، یعنی انجینئرز، ڈاکٹرز، اساتذہ، سائنسدان اور ٹیکنالوجی کے ماہرین کو دیئے جائیں۔ٹیکنو کریٹس کی حکومت کا تصور اس نے دیا جو آج بھی ہمارے جیسے ملکوں میں، کبھی کبھی مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن یہ سوال کہ یہ ٹیکنو کریٹس کیسے اقتدار میں آئیں اور کیسے حکومت کریں؟ اس کا جواب سیس سائموں کے پاس نہیں تھا۔ یہ ایک تصور تھا کہ جس پر اس کے نزدیک عمل کر کے ایک ایسی حکومت قائم کی جاسکتی تھی کہ جو معاشرے میں استحصال کو ختم کرنے میں مدد دے گی۔

ایک اور فرانسیسی سوشلسٹ چارلس فیورے (Charles Feure) نے اس رائے کا اظہار کیا کہ ایک ہزار چھ سو ایک کے لوگوں پر مشتمل ایک کمیون یا برادری قائم کی جائے۔اس کمیون میں ہر شخص کو وہ کام دیا جائے کہ جس سے اس کی دلچسپی ہو۔ جیسے اگر کسی کو پھلوں میں دلچسپی ہے تو اسے باغ کا انچارج بنا دیا جائے، وغیرہ۔کمیون میں عورت اور مرد کے درمیان برابری کو رکھنے کی تجویز تھی، تمام لوگ کام کریں گے اور آپس میں مل کر جو حاصل کریں گے اس میں شراکت ہوگی۔

اس کے نزدیک ایسی کمیون لوگوں کو سکون و اطمینان، خوشی و مسرت، اور شخصی آزادی دے گی۔اس کی زندگی میں تو ایسی کمیون قائم نہیں ہوتی، مگر اس کے مرنے کے بعد امریکہ

میں ایسی کوششیں ضرور ہوئیں، جو زیادہ کامیاب نہیں ہوسکیں۔

کارل مارکس ان کو یوٹوپیائی سوشلسٹ کہتا ہے، کیونکہ یہ نظام کو بدلنے کے بجائے، ان میں اصلاح کر کے یا اس میں رہتے ہوئے، علیحدگی کے ساتھ رہنے کے مسائل کا حل ڈھونڈ رہے تھے، جو اس لئے ناکام ہوا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ان کی گنجائش نہیں تھی۔ مگر اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ جب مسائل ہوں تو لوگ ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور ان کی ناکامی سے دوسرے کامیاب حل کی جانب جایا جاتا ہے۔ اس لئے ان لوگوں نے جو شش کیں، ان کو رَد نہیں کیا جاسکتا ہے، کیونکہ ان کے خیالات نے سائنسی سوشل ازم کی بنیاد رکھی۔

☆.....☆.....☆

سائنٹیفک سوشل ازم اور کارل مارکس

ڈاکٹر مبارک علی

یوٹوپیائی سوشلسٹوں کے برخلاف کارل مارکس نے صنعتی انقلاب اور سرمایہ داری کا سائنٹیفک تجزیہ کیا۔ وہ 1818ء میں جرمنی کے شہر ٹرائر (Triar) میں پیدا ہوا، اس کا باپ وکالت کا پیشہ کرتا تھا، اور یہودیوں کے خلاف پابندیوں کی وجہ سے اس نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ مارکس بھی اس پیشہ کو اپنا وسیلہ روزگار بنائے کیونکہ اس میں معاشی خوش حالی کی ضمانت تھی۔ کارل مارکس نے جب اعلیٰ تعلیم کے لئے بون یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو اس کی دلچسپی قانون کے برخلاف فلسفہ سے ہوگئی۔ اس نے بعد میں برلن یونیورسٹی میں پڑھا اور ینا (Jenna) سے یونانی فلسفہ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ اس وقت جرمنی میں ہیگل کے فلسفہ کا بڑا اثر تھا، مارکس نے اس کے فلسفہ کا انتہائی گہرائی سے مطالعہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ کئی ہفتوں اپنے کمرے میں بند رہا اور ہیگل کا مطالعہ کرتا رہا، جب وہ کمرے سے باہر آیا تو اس نے اعلان کر دیا کہ وہ ہی۔ گے۔ لین ہو چکا ہے۔ اس وقت ہیگل کے فلسفہ کے پیروکاروں میں دائیں بازو کے فلسفی تھے، مارکس بائیں بازو کی جماعت سے تعلق رکھتا تھا، جس کے مشہور فلسفیوں میں فیور باخ (Fever Bagh)، ڈیوڈ اسٹراؤس (David Straus) اور بیونر بائر (Buner Bauer) تھے۔ ان میں فیور باخ

اوراسٹراؤس نے عیسائی مذہب کا سیکولر نقطہ نظر سے تجزیہ کیا، جس نے عیسائیت کے بارے میں ایک نئے سیکولر نظریہ کو پیدا کیا۔ فیور باخ کی مذہب کے اوپر بھی تنقید ہے، جس نے مارکس کو بے انتہا متاثر کیا تھا۔

لیکن ان لوگوں کو جرمنی کی کسی بھی یونیورسٹی میں پڑھانے کے لئے بحیثیت استاد موقع نہیں دیا گیا، کیونکہ ان کے انقلابی خیالات جرمنی کی ریاست پروشیا کے خلاف تھے، اس لئے مارکس نے راہنش اے سائی ٹنگ میں مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ اس دوران اس نے جینی سے شادی کی، جس کا تعلق امراء کے خاندان سے تھا۔ کیونکہ مارکس کے مضامین انتہائی انقلابی تھے، اس لئے پروشیا کی حکومت نے اسے جلاوطن کر دیا۔ مارکس معہ اپنے خاندان کے پیرس چلا آیا۔ یہاں اس نے فرانسیسی تاریخ اور فرانسیسی انقلاب کا مطالعہ کیا، اوراس نتیجہ پر پہنچا کہ انقلاب کی ناکامی یہ تھی کہ انقلابی راہنماؤں نے بورژوا طبقے کی حمایت میں نجی جائیداد کو تحفظ فراہم کر کے انقلاب کو روک دیا اوراس کے عوام کو خارج کر دیا۔

پیرس میں بھی مارکس نے ''یہودی سوال'' (Jevish Quatism) پر لکھا، اس کی تحریر کے مطابق یہودیوں پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ خود پسند، خودغرض، اور پیسہ کی پوجا کرنے والے ہیں، اس کی دلیل کے مطابق یہ اوصاف سرمایہ دارانہ نظام میں ہر فرد کے ہوتے ہیں۔ اس لئے صرف یہودیوں کو موردِ الزام ٹھہرانا درست نہیں ہے۔

پیرس میں رہتے ہوئے مارکس کے خیالات کی تشکیل میں تین عناصر نے حصہ لیا۔ فرانس کے مفکروں اور دانشوروں کے سیاسی خیالات، جرمنی کے فلسفیوں کے فلسفہ اور تاریخ کے افکار، اور انگلستان کے معیشت دانوں کے نظریات، لہٰذا جب اس کی پیرس میں اینگلز سے ملاقات ہوئی تو دونوں نے مل کر جرمن آئیڈیالوجی (German Ideology) لکھی۔ اس کی یہ کتاب ناشروں نے شائع کرنے سے معذوری ظاہر کی، کیونکہ ان کے خیال میں اس کی مارکیٹ نہیں تھی، اور شاید ان کے مطابق اس کے قارئین زیادہ تعداد میں نہیں تھے۔

پروشیا کی حکومت نے یہاں بھی مارکس کو چین سے نہیں رہنے دیا اور فرانس کی حکومت سے درخواست کی کہ اسے وہاں سے نکال دیا جائے۔ مارکس پیرس سے بلجیم چلا آیا۔ یہاں کمیونسٹ لیگ نے اس سے کہا کہ وہ پارٹی کا مینی فسٹو لکھے۔ لہٰذا یہ مینی فسٹو اس نے اور اینگلز نے مل کر لکھا۔ اس میں مارکس نے تاریخی طور پر فیوڈل ازم اور سرمایہ داری کا تجزیہ کیا ہے۔ اس کی زبان میں جوش و جذبہ ہے جو دلوں کو متاثر کرتا ہے۔ اس نے بورژوا طبقہ کی اس لحاظ سے تعریف کی ہے کہ اس نے دنیا کو بدل ڈالا ہے، سرحدوں کو توڑ دیا ہے، پرانے ادارے اور روایت کا خاتمہ کر دیا ہے، ایک نئی دنیا پیدا کی ہے۔ لیکن اس دنیا میں افراد کے باہمی رشتوں کا تعلق پیسہ سے ہے۔ (Cash nerus) اس لئے وہ اس نظام کو بدل کر سوشل ازم اور کمیونزم کی بات کرتا ہے کہ جس میں فرد کو آزادی ہوگی اور انسانی رشتے پیسوں کی قید سے آزاد ہوں گے۔

بلجیم سے وہ انگلستان چلا آیا، جہاں وہ اپنی وفات تک مقیم رہا۔ انگلستان میں اس نے اپنی زندگی انتہائی مفلسی اور غربت کی حالت میں گذاری، یہ غربت اور اس زندگی کا انتخاب اس نے خود آزادی کے ساتھ اختیار کیا تاکہ جن لوگوں کے لئے وہ لکھ رہا تھا، اس زندگی کا اسے تجربہ ہو۔ اس غربت میں اس کی بیوی نے اس کا ساتھ دیا۔ اس کی مالی ضروریات کو اینگلز نے پورا کیا، یا اس نے امریکہ کے اخبار میں مضامین لکھ کر کچھ پیسے حاصل کئے۔

لندن میں رہ کر اس نے اپنا تمام وقت مطالعہ کرنے اور لکھنے میں صرف کیا۔ اس کے مطالعہ کا نتیجہ داس کیپٹل ہے، جس میں اس نے سرمایہ داری کے بارے میں اپنے نظریات کو پیش کیا ہے۔

مارکس نے تاریخ کا جو نظریہ پیش کیا ہے۔ اس کے مطابق میں تاریخ کو کئی ادوار میں تقسیم کرتا ہے۔ ابتدائی انسانی تہذیب کو وہ ابتدائی کمیونزم کہتا ہے جو دور غلامی، فیوڈل ازم، اور پھر سرمایہ داری میں ارتقاء پذیر ہو کر آتا ہے۔ سرمایہ داروں کے بعد وہ کمیونزم کی پیش

گوئی کرتا ہے کہ جو انسانی تہذیب کا آخری دور ہوگا کیونکہ اس میں طبقاتی کش مکش اور تضادات ختم ہوجائیں گے۔

شکار اور غذا جمع کرنے کے عہد اور اس سے پہلے انسان کے ارتقاء کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ اگر چہ انسان کا ارتقاء حیوانوں سے ہوا ہے، مگر اس میں اور دوسرے حیوانوں میں فرق ہے، اور وہ یہ ہے کہ دوسرے حیوان ایک ہی قسم کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں، پرندے اگر گھونسلہ بناتے ہیں تو وہ ہمیشہ ایک جیسا ہوتا ہے۔ لیکن انسان میں تخلیقی صلاحیت ہے وہ ماحول کے مطابق بدلتا رہتا ہے، مثلاً شکار اور غذا جمع کرنے کے دوران اس نے پتھر کے اوزار اور ہتھیار بنائے۔ بعد میں انہیں تبدیل کر کے کانسی اور لوہے کے ہتھیار بنانے لگا۔ اس کی اس تخلیقی صلاحیت نے اسے دوسرے حیوانوں سے ممیّز کر دیا ہے۔

اس لئے مارکس ذرائع پیداوار، یعنی اوزار، آلات، اور ہتھیار اور نظام پیداوار کے درمیان رشتہ دیکھتا ہے۔ اس کے مطابق جب ذرائع پیداوار تبدیل ہوتے ہیں، تو اس کے دباؤ کی وجہ سے نظام پیداوار بھی بدل جاتا ہے۔ مثلاً غلامی کے دور میں، غلام پیداوار کا ایک ذریعہ تھا، لیکن جب غلامی معاشی طور پر بوجھ بن گئی اور اس کا خاتمہ ہوا، تو فیوڈل نظام کی جگہ جس میں فیوڈل اور سرف (Serf) کے طبقے پیدا ہوئے۔ جب ذرائع پیداوار کے لئے مشینیں آئیں، صنعتی انقلاب آیا تو اس کے نتیجہ میں مزدوروں کا طبقہ وجود میں آیا، اور نظام سرمایہ داری پیدا ہوا۔ اس کی اس تشریح کے بعد وہ کہتا ہے کہ نظام پیداوار، ہر دور میں اپنا کلچر پیدا کرتا ہے۔ جس میں ادب، آرٹ، موسیقی، سیاست اور معیشت وغیرہ ہوتی ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں اگر فٹ بال کے کھیل کو دیکھیں تو اس میں اس کی جھلک نظر آئے گی۔ مثلاً تقسیم کار کی طرح اس میں بھی ہر کھلاڑی کے کھیلنے کا مقام ہوتا ہے۔ ٹیم کا منیجر فیکٹری کے نگران کی طرح، کھلاڑیوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ ٹیم کا مالک ہوتا ہے جو ٹیم کی تربیت اور کھیلنے میں اپنا سرمایہ لگاتا ہے، اس سے

پورے سرمایہ دارانہ نظام کی جھلک ملتی ہے۔

مارکس کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہر نظام کے اندر، آنے والے نظام کے جراثیم ہوتے ہیں۔ جب دور غلامی میں فیوڈل ازم کے جراثیم پیدا ہو چکے تھے اور فیوڈل ازم میں سرمایہ دار کے نشانات نظر آنے لگے تھے۔

مارکس جب سرمایہ دارانہ نظام پر تنقید کرتا ہے تو اس کا کہنا ہے کہ اس میں اول تو انسانی رشتے ختم ہو جاتے ہیں، اور ان کی جگہ پیسہ یا سرمایہ لے لیتا ہے۔ دوسرے اس نظام میں طمع اور لالچ کا عنصر ہے جو اسے ایک جگہ ٹھہرنے نہیں دیتا ہے، بلکہ پھیلاؤ پر دباؤ ڈالتا رہتا ہے، جہاں تک مزدور کی حیثیت ہے تو اس کے پاس اپنی محنت کے علاوہ فروخت کرنے کو اور کچھ نہیں ہوتا ہے۔ سرمایہ دار اس کو سستے داموں خریدتا ہے۔ جب وہ 19 گھنٹے یا 8 گھنٹے کام کرتا ہے، تو وہ اس کی صرف ایک یا دو گھنٹہ محنت کا معاوضہ دیتا ہے، باقی محنت وہ ہتھیا لیتا ہے۔ یہ زائد مقدار یا (Surpluss Value) کا نظریہ ہے۔ جو سرمایہ دار کے استحصال کو ظاہر کرتا ہے۔ مزدور اس لئے سرمایہ دار کا محتاج ہوتا ہے کیونکہ ذرائع پیداوار کا وہ مالک ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اپنی شرائط پر مزدور سے محنت کراتا ہے۔

مارکس کا یہ بھی کہنا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں مزدور اپنی تخلیق سے محروم ہو کر اس سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ وہ جو کچھ تخلیق کرتا ہے وہ اس سے چھین لیا جاتا ہے، وہ سرمایہ دار کی ملکیت ہو جاتی ہے۔ اس سے اس نے بیگانگی کے نظریہ کا تصور پیش کیا۔

لہٰذا مارکس کا کہنا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں بڑے کارخانے یا کارپوریشنیں مسلسل اپنی صنعت کو پھیلائیں گی اور اس کے نتیجہ میں چھوٹے صنعت کار یا کارخانے ان کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے، اور سرمایہ چند بڑے صنعت کاروں میں مرتکز ہو جائے گا اس کے نتیجہ میں پرولتاری یا مزدور طبقے میں اضافہ ہوگا اور بالآخر یہ طبقہ سرمایہ دارانہ نظام سے بغاوت کر کے

انقلاب لائے گا اور اس استحصال کا خاتمہ کر دے گا۔

اس کے بعد مارکس نے جو نقشہ یا تصور پیش کیا ہے وہ یوٹوپیائی ہے کہ جب معاشرے پر طبقاتی تضادات ختم ہو جائیں گے تو نہ تو ریاست کے ادارے کی ضرورت رہے گی اور نہ کسی ایک طبقے کی بالادستی ہوگی۔ ٹیکنالوجی کی وجہ سے انسان محنت سے ترقی کرے گا۔ فرصت کے لمحات میسر ہوں گے جن میں وہ موسیقی سے لطف اندوز ہوگا، ادب اور فلسفہ پڑھے گا اور ذہنی طور پر ترقی کرے گا۔

مارکس کے نظریات و افکار نے دنیا کو متاثر کیا، مجبور، بے بس اور استحصال شدہ لوگوں کو امید کا پیغام دیا۔ اس کے نتیجہ میں روس، چین، کیوبا میں انقلابات آئے، یہ انقلابات ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے اور آخر میں ناکام بھی۔

مارکس انقلاب کے ذریعہ تبدیلی کا حامی تھا، جب کہ اس کے اپنے زمانے میں، اس کے ساتھیوں نے اس سے ہٹ کر علیحدہ راہ نکالی۔ مثلاً جرمنی میں لیب کنیخت (Leeb Kneth) اور بے بل (Bebel) نے، سوشلسٹ ورکرز پارٹی قائم کی، اور انقلاب کی جگہ پارلیمانی انتخاب کے ذریعہ پارلیمنٹ میں جا کر قوانین کے ذریعہ سماجی تبدیلی کی بات کی۔ کیونکہ ان کے نزدیک انتخابات کے ذریعہ لوگوں کو باشعور بنا کر الیکشن میں کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے اور یوں انقلاب کے بغیر تبدیلی کے امکانات ہیں۔

مارکس نے دوسرے موضوعات پر بھی لکھا ہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی 1857ء پر اس کے مضامین ہندوستان کی سیاست پر فکر انگیز ہیں۔ مارکس نے خیالات اور نظریات سے علمی دنیا کو متاثر کیا ہے۔ آج تاریخ، فلسفہ، علم بشریات، سیاسیات اور معیشت کا کوئی علم ہو۔ اس میں مارکس کے نظریات نے ایک نئی سوچ پیدا کی ہے۔ لہٰذا اگر عملی سیاست میں مارکسی انقلابات ناکام ہوئے، مگر نئی دنیا میں وہ اب تک زندہ ہیں اور ان کی مدد سے معاشرے کے مسائل کو سمجھا جاسکتا ہے۔

مارکس کی وفات 1882ء میں ہوئی، وہ لندن میں ہائی گیٹ کے قبرستان میں دفن ہے جہاں آج بھی روزانہ سیاحوں کی ایک بڑی تعداد اس کی قبر کی زیارت کرنے آتے ہیں۔ اس قبرستان میں اس کی واحد قبر ہے کہ جہاں ہمیشہ تازہ پھولوں کے گلستہ رکھے رہتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ ابھی تک اسے بھولے نہیں ہیں۔

☆.....☆.....☆

آریا، انڈین قوم پرستی اور سندھ واپسی کی خواہش

رؤف نظامانی

آریاؤں کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ یہ لوگ برصغیر میں دوسرے علاقوں مثلاً وسطی ایشیاء اور یورپ وغیرہ سے آئے تھے۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ یہ لوگ یہاں بڑے لشکروں کی صورت میں وارد ہوئے تھے اور انھوں نے یہاں کے مقامی لوگوں کو زیر کر کے اپنی حکومت قائم کی تھی۔ جبکہ دوسرا نظریہ یہ بھی ہے کہ یہ ایک ہی وقت نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں آئے تھے جو سلسلہ طویل عرصے تک جاری رہا تھا۔ اس پورے عرصے میں انہوں نے نہ صرف اپنے آپ کو سیاسی لحاظ سے مضبوط کیا بلکہ خاص طور پر ہندومت کے ارتقاء اور ویدوں وغیرہ کی ترتیب اور تہذیب کی ترقّی میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

آریاؤں کا وقت آج سے تقریباً سات ہزار سال قبل کا بتایا جاتا ہے۔ جبکہ موئن جو دڑو اور دوسرے قدیم آثار کی کہ مدد سے ماہرین نے یہ اندازے لگائے ہیں کہ سندھ کی تہذیب تقریباً پانچ ہزار سال قدیم ہے۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ شہر یہاں کے قدیم باشندوں دراوڑوں کے تھے جنھیں آریاؤں نے آکر تباہ اور تہس نہس کیا یا آریاؤں کے آباد کئے ہوئے شہر تھے جو بعد میں قدرتی آفات مثلاً سیلاب اور زلزلوں وغیرہ کی وجہ سے تباہ ہو گئے۔

بھگوان ایس گڈوانی، بھارت کے مشہور تاریخ دان اور Sword of Tipu Sultan کے مصنف اپنی کتاب March of the Aryans میں اس سلسلے میں ایک بالکل ہی مختلف نظریہ پیش کرتے ہیں۔ان کا کہنا یہ ہے کہ آریاؤں کے متعلق مواد کی کمی کی وجہ سے ان کی کتاب حقیقت، تحقیق اور فکشن کا مجموعہ ہے اور اسے انھوں نے فکشن کی صورت میں ہی پیش کیا ہے۔ کتاب کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ آریا باہر کے لوگ نہیں تھے بلکہ ان کا تعلق برصغیر سے ہی تھا جو ناسازگار حالات کی وجہ سے ایک آدرشی دنیا کی تلاش میں گروہوں کی صورت میں دنیا کے مختلف علاقوں کی جانب ہجرت کر گئے تھے۔ جب انہیں یہ اندازہ ہوا کہ ان کے اپنے وطن سے زیادہ آدرشی سرزمین کوئی اور نہیں ہے تو ان میں سے بہت سوں نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

مصنف نے کتاب کی ابتداء اپنے قبیلے کے سردار "بھارت" کے ساٹھ سال کی عمر میں رٹائر ہونے کے بعد سندھو کے کنارے رہائش اختیار کرنے سے کی ہے۔ یہ آج سے سات ہزار سال قبل یا پانچ ہزار سال قبل مسیح کا دور ہے۔ایک طوفانی رات میں بھارت کو ایک کشتی میں نوزائیدہ بچے کے ساتھ ایک عورت ملتی ہے جو بچے کو وہاں چھوڑ کر غائب ہو جاتی ہے اور کشتی میں بچے کے ساتھ سفید پھول ساتھ رکھ جاتی ہے۔

اس بچے کے لئے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک طویل عرصے سے جو انتظار تھا کہ سندھ ماتا ان کے لئے کسی بھگوان کو بھیجے گی وہ پورا ہو گیا۔اس بچے کو "سندھو پترا" کا نام دیا جاتا ہے اور لوگ اس کی پوجا شروع کر دیتے ہیں۔

بھارت اور سندھو پترا اس کتاب کے دو اہم کردار ہیں۔سردار ہونے کی حیثیت سے بھارت نے مختلف اہم کاموں کی شروعات کی تھی۔اس سلسلے میں ایک ٹیم کو یہ معلوم کرنے بھیجا گیا تھا کہ سندھو کا منبع کیا ہے جبکہ دوسری ٹیم یہ معلوم کرنے نکلی تھی کہ دریا کا انت کہاں ہے۔اسی طرح اس نے اپنے لوگوں کو سمندر کی جانب بھیجا تا کہ وہ کشتیاں بنانے اور انہیں

چلانے کی تربیت حاصل کریں۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ اس نے دوسرے قبائل کے حملوں کے خلاف اپنے دفاع کو مضبوط کیا اور اپنے قبیلے کے لوگوں کی مخالفت کے باوجود یہ کوشش کی کہ مفتوح لوگوں کو غلام کے طور پر نہیں بلکہ برابری کی سطح پر اپنے ہی قبیلے کا حصّہ بنایا جائے۔

قبیلے کے مراعات یافتہ طبقات کی جانب سے غلامی کو ختم کرنے کی مزاحمت ہوتی ہے اور بھارت کے رٹائر ہونے کے بعد ایسی چیزوں کو ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں سندھو پترا کا کردار معجزاتی کردار کا حامل ہو جاتا ہے۔ بھارت ابتداء سے ہی یہ سمجھتا ہے کہ لوگوں کی سندھو پترا کو دی گئی ایک بھگوان کی حیثیت اور اس کی ہر چھوٹی بڑی خواہش کی تکمیل اسے بگاڑ دے گی۔ اسے اس چیز کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ایک بھگوان کو بھی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے۔ اس بات کے پیش نظر وہ اسے ایسے مختلف لوگوں کے پاس بھیجتا ہے جن سے وہ کچھ سیکھ بھی سکے اور لوگوں کی نظروں سے بھی دور رہے۔ اس عمل میں اسے یہ جانکاری بھی ہوتی ہے کہ اس کے روحانی باپ بھارت کے کیا آدرش ہیں جن کی تکمیل سے اس کے لوگ ترقّی کر سکتے ہیں۔

وہ جب بھیس بدل کر حالات کا جائزہ لینے نکلتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے باپ نے جو اقدامات کئے تھے ان سب کو ختم کیا گیا ہے اور لوگوں کو ایک بار پھر ذلّت، تکالیف اور غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اپنی سندھ پترا والی حیثیت کو ظاہر کرنا پڑتا ہے جس سے لوگ پہلے ہی واقف ہوتے ہیں۔ یہ حیثیت لوگوں کو اکٹھا کرنے اور انہیں غلامی کے خلاف لڑنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ وہ نہ تو واعظ کرتا ہے۔ اور نہ نصیحت اور نہ ہی اس کے پاس مختلف سرداروں اور بادشاہوں سے لڑنے کے لئے کوئی طاقت ہوتی ہے لیکن اس کے پاس ایک اخلاقی طاقت ہوتی ہے۔

خاموشی اور لوگوں سے پیار دو طاقتور ہتھیار ہوتے ہیں۔ غلامی کو ختم کرنے کا سلسلہ صرف سندھ تک محدود نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک جانب گنگا جمنا کے میدانوں اور دوسری جانب

جنوبی ھندوستان تک پھیل جاتا ہے۔ سندھو پترا کے ماننے والوں میں دن بدن اضافہ ہوتا رہتا ہے اور ساتھ ساتھ اس کی طاقت بھی بڑھتی رہتی ہے۔ پورے علاقے کے حکمرانوں میں سے کسی میں یہ ہمّت نہیں ہوتی کہ وہ سندھو پترا کے اصولوں کے خلاف عمل کرے۔ اس طرح کتاب کے مصنف نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ مختلف سیاسی حکمرانوں کے باوجود سندھو پترا کی سربراہی میں مذہبی اور اخلاقی لحاظ سے ہندوستان کی تقریباً وہی سرحدیں تھیں جو بعد میں ایک متحدہ ہندوستان کی تھیں۔

سندھو پترا کا اس طرح طاقتور ہونا ظاہر ہے کہ مختلف علاقائی حکمرانوں اور سرداروں کے لئے کوئی پسندیدہ بات نہیں تھی۔ اب بھی یہ ہی ہوتا ہے کہ حکمران طبقے کی جانب سے جس کو عوام کے قریب اور اپنے مفادات کے حصول میں رکاوٹ تصوّر کیا جاتا ہے اسے راستے سے ہٹانے کے لئے کوششیں کی جاتی ہیں۔ اسی طرح بالکل اسی انداز میں جس طرح گاندھی جی کو عبادت کے دوران قتل کیا گیا تھا سندھو پترا کو بھی صبح کی عبادت کے لئے آتے ہوئے قتل کر دیا جاتا ہے۔ جیسا اس طرح کی سازشوں میں ہوتا ہے۔ قاتل کا کام دوسرے لوگ تمام کر دیتے ہیں جبکہ وہ خود بھی محفوظ نہیں رہتے اور اس طرح اصل قتل کئی پردوں میں چھپ جاتا ہے اور قاتلوں کا سراغ نہیں مل پاتا۔

اس کے بعد جیسے وقت پیچھے کی جانب لوٹنا شروع ہو جاتا ہے اور لوگوں کے لئے وہی تکالیف، ذلّتوں اور غلامی کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ جب سندھو پترا کے قریبی ساتھیوں کو ایک کر کے راستے سے ہٹایا جاتا ہے تو اس بات میں کوئی شک نہیں رہتا کہ قتل کے پیچھے کون سے ہاتھ ہیں کس کے مفاد ہیں۔

عام آدمی جیسا کہ ایسے موقعوں پر اکثر ہوتا ہے، یہ یقین کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ سندھو پترا مر گئے ہیں یا ان سے الگ ہو گئے ہیں اور وہ یہ ہی سمجھتے ہیں کہ بس ان کے مسیحا ان سے ناراض ہو کر یا دوسری وجہ سے کسی اور سرزمین کی جانب چلے گئے ہیں۔ ہندوستان

کے مختلف علاقوں سے لوگ بڑے پیمانے پر گروہوں کی شکل میں اس مقدّس سرزمین کی تلاش میں سمندر اور زمین کے راستوں سے نکل پڑتے ہیں۔ مصنف اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ حکمرانوں نے اس نقل مکانی میں لوگوں کی مدد کی اور مختلف ملکوں کے حکمرانوں سے ان لوگوں کو اپنے ملکوں میں آنے کی اجازت دینے کے لئے کہا تا کہ ان کے خلاف مزاحمت میں کمی آسکے۔

یہ لوگ بیشمار تکالیف کا سامنا کرتے ہوئے افغانستان، ایران، ترکی، وسط ایشیاء، مصر، جرمنی اور یورپ کے مختلف ملکوں کی جانب روانہ ہوتے ہیں۔ ان ملکوں میں سے کہیں بھی یہ نظر نہ آیا کہ وہ تہذیبی لحاظ سے ان سے زیادہ ترقّی یافتہ تھے یا ان کے ذہن میں جس آدرشی سرزمین کا تصوّر تھا اس سے مطابقت رکھتے ہوں یا یہ کہ وہاں ان کے رہنما سندھو پترا سے ملاقات ہوسکتی ہو۔ اس کے برخلاف وہ لوگ پچھڑے ہوئے تھے اور یہاں کے لوگوں نے ہی انہیں تہذیب اور طور طریقے سکھائے۔ بہت جلد یہ بات واضح ہوگئی کہ جس مقدّس سرزمیں کی تلاش میں وہ اپنے وطن سے نکلے تھے وہ صرف ایک سراب تھا۔ اس لئے بہت سوں نے واپسی کا سفر اختیار کیا اور بہت سے ان نئے ملکوں میں ہی مستقل طور پر رہائش پذیر ہوگئے۔

آریا کو عام طور مہذّب اور ترقی یافتہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن مصنف یہاں اسے دوسری معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "ریا" کا مطلب قوم اور عوام ہے۔ سندھو پترا قتل کے بعد ان کے ماننے والوں نے اپنے آپ کو حکمرانوں سے الگ دکھانے اور یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ ان میں سے نہیں ہیں اپنے آپ کو " آریا" یعنی غیر کہنا شروع کیا۔ لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہندو مذہب میں ذات پات کا کوئی تصوّر نہیں ہے اور نہ ہی گیتا میں اس کا کوئی ذکر ملتا ہے۔ ذات پات کا یہ نظام ہندوستان میں بیرونی حملہ آوروں کی چالوں کی وجہ سے مضبوط ہوا۔

مستند تاریخی شواہد نہ ہونے کی وجہ سے بھی مصنف کو اپنے اس نظریے کو ایک تحقیق کے بجائے فکشن کا روپ دینا پڑا ہے۔ دوسری بات یہ کہ انتہائی سادگی سے لیکھک آریاؤں کے سارے پیچیدہ معاملے کو سندھ سے تعلق رکھنے والے ایک شخص سے منسوب کر دیتے ہیں جن کا قتل ایک بڑے پیمانے پر نقل مکانی یا EXODUS کا سبب بن جاتا ہے جن میں سے بہت سے لوگ مختلف ملکوں سے ہوتے ہوئے واپس ہندوستان لوٹ آتے ہیں۔ ان سب کرداروں اور واقعات کو منہا کر کے اس بات پر بحث ہو سکتی ہے کہ آیا آریاؤں کا تعلق واقعی ہندوستان سے تھا اور وہ یہاں سے جانے کے بعد پھر یہاں لوٹ آئے تھے۔ لیکن اس کے لئے مصنف کے پاس دلائل اور شواہد موجود نہیں ہیں جو کہ کسی بھی Established Theory کو چیلنج کرنے کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔

اس ناول کے محرّکات میں ایک تو انڈین قوم پرستی واضح طور پر نظر آتی ہے جس لیکھک نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ھندوستان نظریاتی، مذہبی اور جغرافیہ کے لحاظ سے ہمیشہ ایک اکائی کی صورت میں رہا ہے۔ دوسری بات آریاؤں کی واپسی کے پس منظر میں شاید بھارت ہجرت کرنے والے ہندوؤں کے لاشعور میں سندھ لوٹنے کی خواہش ہے۔ جبکہ لیکھک کے اس Hypothesis کو Thesis کی شکل دینے کے لئے ابھی بہت تحقیق اور کام کی ضرورت ہے۔

☆.....☆.....☆

چین میں تہذیب کا ارتقا

اشفاق سلیم مرزا

چین بھی اُن تمام ارضیاتی، جغرافیائی اور بشریاتی ادوار سے گزرا جن سے دنیا کے باقی خطوں کا واسطہ پڑا اور اُس میں بھی دنیا کے باقی خطوں کی طرح تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ پرانی دنیا یعنی افریقہ، ایشیا اور یورپ جہاں آخری ہزاروی قبل از مسیح میں ایک دوسرے سے معاشی اور سماجی سطح پر روابط استوار ہونا شروع ہو گئے تھے، چین بظاہر اُن سے الگ رہا۔ اگر کوئی رابطہ ہوا بھی تو اتنا منفرد تھا کہ اُس کی کڑیاں جوڑنا کارِدارد نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

ہم ارضیاتی تبدیلیوں کو ایک علیحدہ باب کے طور پر زیرِ بحث نہیں لائیں گے وہ ایک ایسا تکنیکی موضوع ہے کہ میرے اور قارئین کے لیے بارگراں ہے۔ اس کو ایک طرف رکھتے ہوئے قدیم حجری دور کے آثاریات کا ضرور مختصر سا ذکر کریں گے کہ اُس کے بغیر چارہ نہیں اور بات نہیں بنتی۔ یہ کام ہم پیکنگ انسان (Peking Man) سے شروع کرتے ہیں جو بشریاتی سفر کا ایک اہم سنگِ میل ہے۔

پیکنگ (بیجنگ) انسان کا مسکنِ غار

چین میں قدیم حجری دور (Paleolithic Age) کی طرف اہم پیش رفت ڈریگن

ہڈیوں کی پہاڑی (Dragon Bone Hill) کے غاروں کی دریافت ہے۔ یہ غاریں بیجنگ سے تقریباً 50 کلومیٹر جنوب مغرب کی طرف چاؤ کاؤتیئن (Choukoutien) کے مقام کے قریب واقع ہیں۔ان کی دریافت بھی ہڑپہ کی طرح اتفاقی ہے۔گو یہ دریافت مشہور ماہر بشریات پائی وین چنگ (Pie Wen Chung) سے منسوب ہے لیکن ان کو سب سے پہلے چونے کے پتھروں کی کھدائی کرتے ہوئے کان کنوں نے دیکھا جنھیں وہاں سے بہت سے جانداروں کی ہڈیاں ملیں ۔ وہ ان رکازیاتی نمونوں کو دیکھ کر بہت حیران ہوئے ۔وہ سمجھے کہ شاید یہ بلاؤں یا غیرانسانی مخلوق کی ہڈیاں ہیں اس لیے انھوں نے اس پہاڑی کو جس میں یہ غار واقع ہیں، بلا کی ہڈیوں کی پہاڑی (Dragon Bone Hill) کہنا شروع کر دیا۔

دراصل اس جگہ پر مزدور اکثر کھدائی کرتے رہتے تھے۔انھیں یہاں سب سے پہلے 1918ء میں پرندوں خصوصاً مرغیوں اور دودھ دینے والے کچھ جانوروں کی ہڈیاں ملیں۔ پھر ماہر آثاریات نے اس کام میں دلچسپی لینا شروع کر دی اور باقاعدہ سائنسی طریقہ کار کا اطلاق کیا گیا اور اس طرح 1923ء میں دو انسانی دانت اور متحجر (Fossilized) اوپر والا Molar دریافت کر لیا گیا۔ یہ اس سلسلے کی بڑی کامیابی گردانی گئی۔ 1927ء سے لے کر 1928ء تک مزید پیش رفت ہوئی اور نچلے جبڑے سمیت کئی انسانی دانت دریافت ہوئے لیکن اصل کامیابی 2 دسمبر 1929ء کو شام چار بجے ہوئی جب ایک جگہ مکمل انسانی کھوپڑی کو بحفاظت نکال لیا گیا۔ (Chia Lan-Po 1975. 12) اس کے ملنے کے بعد یہ آسان ہو گیا کہ اسی دور کی دوسری جگہوں سے ملنے والی انسانی کھوپڑیوں سے اُس کا موازنہ آسان ہو گیا۔اسی طرح اُن میں کئی مماثلتیں پائی گئیں۔اس وقت اُس غار میں ایستادہ انسان (Homo-erectus) کی رہائش کا اندازہ آج سے پانچ لاکھ سال سے تین لاکھ سال لگایا گیا تھا۔سوویت محققین کا کہنا یہ ہے کہ سنان تھروپس دماغ کے اگلے حصے کی نشوونما

کمزور تھی اور انسان نما بن مانسوں کے زیادہ قریب تھی (Nesturkh, 1965, 38)۔

جس غار سے پیکنگ انسان کے ڈھانچوں کی ہڈیاں ملیں اُن سے پہلے وہاں ککڑ بگے (Hyenas) رہا کرتے تھے۔ اُن ڈھانچوں کی وہاں کثیر تعداد پائی گئی۔ مکمل کھوپڑی کی دریافت کے بعد اُس کو بشریاتی نام سنان تھروپس (Sinanthropus) دیا گیا اور مزید تخصیص کے ساتھ اُسے بعدازاں سنان تھروپس پیکینینس (Sinanthropus Pekinensis) کہا جانے لگا۔

یہ انسان جیسا بھی تھا آگ کا استعمال جانتا تھا اور پتھر کے اوزار بناتا تھا۔ وہ آگ کو پیدا نہیں کر سکتا تھا یعنی آگ جلانے کے فن سے نابلد تھا لیکن وہ آگ کو محفوظ کرنے اور مسلسل جلتے رکھنے کے ڈھنگ سے واقف تھا۔ وہ آگ کو ساتھ لیے پھرتا رہا۔ کھدائی کے دوران غار کے اندر جو راکھ کی تہیں ملی ہیں اُن سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

اگر اس مفروضے سے چلیں کہ انسان وہ حیوان ہے جو اوزار بناتا ہے تو پیکنگ انسان اس تعریف پر پورا اُترتا ہے۔ اس غار سے پتھروں کے اوزاروں کے جو نمونے ملے ہیں وہ انسان کی اس خصوصیت اور ہنر کا پتہ دیتے ہیں۔ مسکن غار سے باہر جو دنیا بکھری ہوئی تھی اُس میں سے کارآمد پتھروں کا انتخاب کر کے اوزار بنائے تاکہ فطرت کو رام کرنے کے لیے پہلا وار کر سکے۔ میرے خیال میں جہاں کہیں بھی ایسا ہوا وہ انسانی کلچر کے نقش اُبھارنے کی طرف پہلا قدم تھا۔ اُس انسان نے حجری بلور، چقماق، سنگ مردہ، ریت پتھر اور دودھیا پتھر سے اوزار بنانا شروع کر دیا تھا۔ یہ پتھر اُسے دو کلومیٹر کے علاقے اور دریا کی تہہ سے مل جاتے تھے۔ وہ عموماً بیضوی شکل کے پتھروں کو یک دھاری یا دو دھاری کلہاڑوں کی شکل دے دیتا تھا۔ ماہرین آثاریات اُنھیں اپنی اصطلاح میں بغدے (Chopper) کہتے ہیں۔ یہ اُس وقت ایندھن کے لیے لکڑی کاٹنے اور شکار کے لیے ڈنڈوں کو نوکیلا بنانے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔

ایک دوسری وضع کے پتھر کے اوزار بھی ملے ہیں جنھیں صفا کار (Scraper) کہا جاتا ہے۔ یہ باقی اوزاروں کی سطح کو ہموار کرنے کے لیے استعمال میں لائے جاتے تھے اور کچھ غار میں روزمرہ کے کام کاج میں سہولت پیدا کرنے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ان اوزاروں میں نفاست آتی گئی اور یہ زیادہ نوکیلے اور خوش وضع ہوتے گئے۔ محققین کی ان کے استعمال کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ کچھ کا خیال تو یہ ہے کہ یہ جانوروں کی کھال، درختوں کی چھال اور جانوروں کی ہڈیوں میں سے گودا نکالنے کے لیے استعمال ہوتے تھے (Chia Lan-Po. 1975, 29-30)۔ ان اوزاروں میں پتھر کے ہتھوڑے اور اہرن بھی ملے ہیں جو بڑے پتھر کے ٹکڑوں کی اوپری سطح یعنی چھلکا اُتارنے اور اُنھیں مسطح کرنے کے لیے استعمال میں لائے جاتے تھے۔

پیکنگ انسان نہ صرف پتھروں سے اوزار بنا کر استعمال کرتا تھا بلکہ بعض جانوروں کی ہڈیوں پر بھی دستکاری کے بعد بطور اوزار استعمال کرتا تھا۔ اس میں ہرن کے سینگ کا ماہر آثاریات نے خصوصی طور پر ذکر کیا ہے۔ یہ سینگ جڑ کے قریب بہت سخت اور مضبوط ہوتے ہیں انھیں چھوٹے ہتھوڑوں کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا جبکہ اُن کے اگلے نوکیلے حصے کھدائی اور سوراخ کرنے کے کام آتے تھے۔ اسی طرح اُن کی کھوپڑیوں سے پیالوں کا کام لیا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پانی اور دوسرے مشروبات کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ اسی طرح ہرنوں اور چوپایوں کی ٹانگوں اور بازوؤں کی ہڈیاں بطور چاقو اور جڑی بوٹیاں نکالنے کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ انہی اوزاروں اور انسانی محنت نے بتدریج ایستادہ انسان سے شعوری انسان تک کا سفر طے کروایا۔

جہاں خود سے بنائے ہوئے اوزاروں نے انسان کی نشوونما میں اہم کردار ادا کیا وہاں آگ نے بھی جو قدرتی طور پر حاصل ہوئی اُس کو سنوارنے میں اپنا حصہ ڈالا جو اوزاروں سے کس طرح کم نہیں ہے۔ یونانی دیومالا میں پرومیتھیس (Prometheus) کے کردار

سے کون واقف نہیں جس نے انسان کو آگ سے متعارف کروانے اور دوسرے ہنر سکھانے پر زیوس (Zeus) کی ناراضگی مول لی اور اکیلی چٹان پر زنجیر بستہ ہو کر سزا کاٹنی پڑی۔ اسی طرح چین کی داستانوں میں جس شخص نے انسان کو آگ سے روشناس کروایا اُس کا نام سوئی جین شی (Sui Jen Shih) تھا جس نے آگ لکڑی میں سوراخ کرتے ہوئے دیکھی۔ اس طرح قدرت میں آگ کی موجودگی کے علاوہ انسان نے خود سے آگ پیدا کرنے کا طریقہ سیکھ لیا لیکن پیکنگ انسان کے مسکن غار سے پہلے بھی انسان آگ کا استعمال جانتا تھا۔ اس کے بھی کئی ایک شواہد ملتے ہیں۔

چاؤ کاؤ تیئن کی غار میں راکھ کی موٹی تہیں ملی ہیں۔ یہ تہیں مختلف گہرائیوں پر ملیں ہیں اور اُن کے خاص مقامات بھی نہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انسان آگ کو محفوظ کرنے کا طریقہ بھی جانتا تھا۔ راکھ کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ بھی پتہ چلا ہے کہ آگ کا ماخذ زیادہ لکڑی ہے۔

گو داستان گوئی میں انسان کے آگ پیدا کرنے کا ذکر موجود ہے لیکن زیادہ تر محققین کا خیال ہے کہ پیکنگ انسان نے آگ قدرت سے حاصل کرنے کے بعد اسے محفوظ کرنا سیکھ لیا تھا لیکن خود سے آگ پیدا کرنے پر قادر نہیں تھا۔

پیکنگ انسان، ماحولیات اور بود و باش

اس مسکنِ غار کے آس پاس جنگل تھے جن میں چیڑ، صنوبر اور دیودار کے درخت پائے جاتے تھے۔ ان درختوں کی متحجر باقیات اس بات کا پتہ دیتی ہے جبکہ جھاڑیوں میں بیری اور ریڈ بڈ پائی گئی تھیں۔ اس کے جنگلوں میں خنجر نما دانتوں والے شیر، بھینسے، چیتے، بھیڑیئے، کالے اور بھورے ریچھ، سرخ کتے اور Raccoon پائے جاتے تھے جبکہ جنوب مشرق کے میدانوں میں لگڑ بگے، گینڈے، گھوڑے، ہرن اور ہاتھی بھی تھے اور دریاؤں کے

کنارے مختلف جڑی بوٹیاں بھی کثیر تعداد میں پائی جاتی تھیں۔ دریاؤں میں اودبلاؤ اور مچھلیاں ملتی تھیں۔

اس انسان نے 20 لاکھ سال پہلے اوّلین پتھر کے اوزار اور ہتھیار بنانے سے آگے کی طرف زیادہ سفر نہیں کیا تھا۔ بڑے جانوروں کا شکار کرنا اب بھی اُس کے لیے بہت مشکل تھا کیونکہ ابھی تک شکار کرنے والے ہتھیاروں نے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ شکار کے لیے اب بھی زیادہ تر ڈنڈوں، لکڑی کے بھالوں اور پتھروں کا استعمال ہوتا تھا۔ اس کی مدد کے لیے جلتی ہوئی مشعلیں بھی کبھی ساتھ ہوتی تھیں اور اس سلسلے میں آگ سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ وہ جانوروں کو بھگا بھگا کر چٹانوں سے گرا کر یا کھڈوں میں گرا کر بھی بے بس کر دیتا تھا۔ اس سلسلے میں اُس کے دماغ کی جانوروں کے دماغ پر فصیلت کام دیتی تھی لیکن اُس کا زیادہ تر انحصار چھوٹے جانوروں پر تھا جو اتنے تیز اور خونخوار نہیں تھے۔

ماہرین بشریات کی رائے یہ ہے کہ اس زمانے میں ہر چھوٹے بڑے صحت مند انسان یعنی مرد، عورت اور بچوں کو اپنے اپنے ذمے اور ہمت اور طاقت کے مطابق کام کرنا پڑتا تھا اور ساتھ ساتھ آبادی کا گروہی تناسب ایسا رکھنا پڑتا تھا کہ خوراک کی فراہمی اور آبادی کی ضرورت کا توازن قائم رہے۔

مزید آثاریاتی شواہد

چاؤ کاؤ تیئن کے علاوہ بھی چین میں کئی ایک ایسے مقامات دریافت ہوئے ہیں جن سے چین کے تہذیبی سفر کی داستان کا سراغ ملتا ہے۔ اُن میں یہاں کچھ دریافتوں کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

1957ء میں ہسیاؤلنگ ٹان کیان کنٹری (Hisiaolungtan, Kiayan Country) کے مقام سے جو یونان صوبے میں واقع ہے راما پیتھیکس کے پانچ متحجر دانت

ملے۔ یادرہے کہ راما پیتھیکس اُس انسان کو کہا گیا جس کے آثار پاکستان میں وادی سون کے علاقے اٹک سے دریافت ہوئے تھے اُس کا مخصوص نام راما پیتھیکس پنجابیکس (Rama Pithecus Punjabicus) رکھا گیا تھا۔اس انسان کے دور کا اندازہ ایک کروڑ سال پہلے لگ بھگ لگایا گیا تھا۔

1960ء سے لے کر 1965ء تک بہت سے ایسے مقامات دریافت ہوئے جن میں 1965ء میں صوبہ یونان میں یوآن مُو (Yuanmou)،شالسی صوبے میں شی ہوٹو گاؤں(Hsihoutu Village) اور کے ھو گاؤں (Keho Village) میں ایسے نمونے ملے ہیں جن کا زمانہ قبل از چاؤ کاؤ تیئن ہے۔اس کے علاوہ اسی صوبے سے چن چیاؤ وو(Chenchiawo) کے علاقے سے جبڑے اور کھوپڑیاں دریافت ہوئی ہیں جن کے بارے میں بھی یہ کہا جارہا ہے کہ وہ بھی پیکنگ انسان سے پہلے ادوار کی ہیں۔

ان دریافتوں پر جدید تحقیقات سے یہ پتہ چلا ہے کہ پیکنگ انسان کا تعلق قدیم منگولی نسل سے تھا جن کا تعلق چینیوں،اسکیمو اور امریکی انڈین سے جوڑا جاتا ہے۔اس سے اُن کے بارے میں پہلے سے قائم شدہ نظریے کو رد کر دیا گیا ہے کہ ان کا تعلق کسی ایسے قبیلے سے تھا کہ جو باہر سے آ کر یہاں آباد ہوا تھا اور جسے اصل چینیوں نے بعد ازاں ختم کر دیا تھا۔ بعد کی تحقیق سے یہ بھی پتہ چلا کہ بشریاتی طور پر زیادہ گہرائی سے ملنے والی کھوپڑیوں اور کم گہرائی سے ملنے والے نمونہ میں تبدیلی کا عنصر پایا جاتا تھا۔گو اُن کا تعلق ایک ہی نسل سے تھا۔بعد میں ملنے والے نمونوں سے اُن کی دماغی سطح پر ترقی یافتہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

قدیم حجری دور کے دوسرے آثار سے موازنہ

یورپ میں نی اینڈرتھل(Neanderthal) آدمی دریافت ہونے سے پہلے انسانی نشوونما کے سلسلے میں بہت سی دریافتیں ہوئیں جو اُس کی اوّلیں حیاتیاتی اور بشریاتی زندگی کا

پتہ دیتی ہیں۔ان میں سے ہیڈل برگ انسان(Heidelberg Man)ایٹلین تھروپس (Atlanthropus)،ٹیلین تھروپس (Telanthropus)،پیتھی کین تھروپس (Pithecanthropus)اور سنان تھروپس(Sinanthropus) بہت اہم ہیں۔یہ اُن سب انسانوں کی مثالیں ہیں جو کہ نی اینڈرتھل کے قریب ترین تھے (Nesturkh, 1965, 36)۔

پہلے پہل یہ کہا جاتا تھا کہ سب سے قدیم انسان کے نمونے انڈونیشیا میں جاوا سے ملے جنھیں بشریاتی اصطلاح میں پیتھی کین تھروپس کا نام دیا گیا لیکن اب یہ کہا جارہا ہے کہ سب سے قدیم ترین انسان کے باقیات ایتھوپیا سے ملے ہیں کیونکہ عام طور پر افریقہ کو ہی موجودہ انسان کے ارتقا کا مرکز قرار دیا جاتا رہا ہے۔بہرحال ابھی اس کے بارے میں مزید انکشافات ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔

مروجہ روایت کے مطابق پیتھی کین تھروپس اور سنان تھروپس انسانوں کی مثالیں ایسی ہیں جنھیں ہم نی اینڈرتھل انسان سے پہلے کی مصدقہ مثالیں قرار دے سکتے ہیں۔سنان تھروپس کی تفصیل تو ہم بیان کر چکے ہیں کیونکہ یہ پیکنگ کے انسان کا بشریاتی اصطلاحی نام ہے لیکن اب ہم پیتھی کین تھروپس کا ذکر مختصراً ضروری سمجھتے ہیں۔اس دریافت کا سہرا ڈاکٹر ایوگینی ڈیوبوا(Eugene Dubois) کے سر بندھتا ہے۔یہ دریافت 95-1890ء کے درمیانی عرصہ میں جاوا میں تحقیقاتی مطالعہ کے دوران ہوئی جبکہ ایک بڑی تعداد میں دودھ پینے والے جانوروں یعنی پستانی حیوانوں، رینگنے والے جانوروں کے رکازیاتی نمونے کو نکال لیا گیا۔یہ مقام جہاں یہ دریافتیں ہوئیں انڈونیشیا میں جاوا میں ایک پہاڑی سلسلے کیوڈنگز (Keudengs) کے علاقے میں واقع ہے۔ڈاکٹر ڈیوبوا نے اپنی تحقیقات کے نتائج کو ایک مضمون "On Pithecanthropus Erectus" میں 1896ء کو شائع کیا (Heizer, 1962, 126)۔

وہاں سے جو کھوپڑی ملی اُس کے بارے میں اُنھوں نے وثوق کے ساتھ یہ کہا کہ یہ ایک بڑے انسان نما مانس (Anthropoid ape) کی ہے۔ فرانس کے پروفیسر منوور یئر(Manouvrier) اور امریکہ کے پروفیسر مارش نے اُن کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ مانس اور انسان کے درمیانی حیوان کی ہڈیاں دریافت ہوئی ہیں۔ یہ ہڈیاں ڈیوبوا کو دریائے سولو کے کنارے ترینیل (Trinil) گاؤں سے ملی تھیں لیکن اس سلسلے کی بڑی دریافت اگست 1891ء میں ہوئی۔ یہ کھوپڑی کا اوپر کا حصہ، دانت اور ران کی ہڈی تھی۔ اُس کے نزدیک یہ مانس اور انسان کے کسی درمیانی مخلوق کی ہڈیاں تھیں۔ ڈیوبوا نے اُس کو پیتھی کین تھروپس ایستادہ (Pithecanthropus erectus) کا نام دیا(Heizer, 1962, 127)۔ ماہرین کے نزدیک وہ اب مانس نہیں تھا لیکن فی الحال انسان بھی نہیں ہوا مگر دوسرے مانسوں کے مقابلے میں وہ زیادہ سیدھا چلتا تھا۔ وہ انسان تو نہیں تھا لیکن مانس بھی نہیں رہا تھا(ایلین بیگال 1990ء،43)۔

موجودہ انسان کا قریب ترین جد امجد نی اینڈرتھل انسان کو کہا جاتا ہے۔ اس کی دریافت بھی 1857ء میں ایک چونے کے پتھر کے غار سے ہوئی۔ یہ غار جرمنی میں ہوشڈل (Hochdal) کے قریب ہے۔ ہوشڈل ڈوسل ڈروف (Dussel dorf) اور البرفیلڈ (Elberfeld) کی درمیانی راہ میں واقع ہے۔ گو اس طرح کے نمونے پہلے بھی ملے تھے لیکن اُن کی اہمیت کا اس دریافت کے بعد ہی پتہ چلا۔ جیسا کہ 1848ء میں جبرالٹر کے مقام پر ایک کھوپڑی ملی تھی جو نی اینڈرتھل کے انسان سے ملتی جلتی تھی۔ پروفیسر ڈی شیف ہاوسن (Prof. D. Schaafhausen) نے اس کا ایک تفصیلی خاکہ اپنی رپورٹ میں درج کیا تھا۔

پہلی دفعہ اس بات کو تسلیم کیا گیا کہ اس انسان کا دماغ پیتھی کین تھروپس کے دماغ سے بڑا تھا اور حجم 1400 سی سی موجودہ انسان کے برابر تھا۔ یہ ایک انتہائی اہم دریافت تھی

جو بعدازاں ارتقائی تسلسل میں کرومیگنن (Cromagnon) پر منتج ہوا جو موجودہ انسان سے بالکل ملتا جلتا تھا۔

انسان کے ارتقا کے اس بیان سے صرف یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ سنان تھروپس اس ارتقا کی ایک اہم کڑی تھا اور پیکنگ انسان کی دریافت عالمی تہذیبی منظرنامے پر ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

چینی نظریہ تکوین اور تقابلی جائزہ

یہ دنیا کیسے تخلیق ہوئی قدیم تہذیب کے اوّلیں کہانی کاروں نے تخیلاتی سطح پر اپنی اپنی کہانیاں بُنیں۔ وہ خواہ سمیری، مصری یا ہندوستانی تہذیب ہو اُن سب کا اپنا ایک نظریہ تکوین ہے۔ بعض صورتوں میں اُن میں ایک مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ پھر بھی ہر ایک کی ایک الگ پہچان ہے۔

چینی نظریہ تکوین کی اوّلیں کہانیوں کے مطابق پہلے پہل دو بحر (Oceans) تھے۔ ایک جنوب میں تھا اور دوسرا شمال میں اور اُن کے درمیان ایک قطعہ زمین تھا۔ جنوبی بحر کا حکمران شو (Shu) بے لگام (Heedless) تھا اور شمالی بحر کا ہو (Hu) یعنی جلد باز (Hasty) جبکہ درمیانی قطع زمین پر ہوان ٹو یعنی انتشار (Chaos) حکومت کرتا تھا۔ انتشار کا رویہ اُن کی طرف مشفقانہ تھا۔ وہ اُسے اس رویے کا صلہ دینا چاہتے تھے۔ انتشار پانچوں حسوں سے عاری تھا۔ اُنھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے وہ یہ حسیں عطا کریں۔ بے لگام اور جلد باز، انتشار سے روز ملتے تھے اور اس طرح سات دنوں میں اُنھوں نے اُسے سات حِسیں عطا کیں لیکن حسیات کو پا کر پُرانا انتشار مر گیا۔ اس طرح سات دنوں میں یہ کائنات تخلیق ہوئی اور انتشار کی جگہ نظم اور توازن نے لے لی اور اُس کا نام کائنات (Cosmos) رکھا گیا (Mackenzie, 1995)۔

اسی طرح بابلی دیومالا کے مطابق ہر طرف پانی ہی پانی تھا یا سمندر تھا۔ آسمان اور زمین بے نام تھے۔ صرف آپسو تھا جو غرقاب کا باپ تھا اور ماں قیامت تھی جو کہ انتشار کی علامت تھی۔ ابھی میدان وجود میں نہیں آئے تھے نہ ہی کوئی دلدل تھی اور نہ ہی دیوتاؤں کا کوئی وجود تھا۔ اس دوران پانی میں ایک ہلچل پیدا ہوئی اور مختلف دیوتا نمودار ہو گئے۔ دیوتا میں سے پہلا Lachmu تھا اور دیوی Lachamu تھی۔ اس کے بعد ایک طویل عرصہ بیت گیا تو دیوتا انشر (Anshar) اور دیوی کِشر (Kishar) ظہور پذیر ہوئے اور اسی طرح اور بہت سے دیوی اور دیوتا پیدا ہوئے۔ اس کے بعد آسمان کا دیوتا اَنو (Anu) سامنے آیا جس کی ساتھی اناتو (Anatu) اور اِیا (Ea) تھی۔ اِیا جو عقل مند ترین اور سب سے طاقتور تھی۔ اِیا کی ساتھی انکی (Inki) بھی تھی جو زمین کی دیوی تھی۔ اِیا اور ڈمیکنا کا بیٹا بیل (Bel) تھا جس نے بعد ازاں نوعِ انسان کو پیدا کیا (Mackenzie, 1996)۔

مصری نظریہ تکوین سے متعلق بہت سی کہانیاں لوک روایت میں چلی آ رہی ہیں لیکن پانی، تاریکی اور انتشار باقی دنیا کی طرح اُن میں بھی پایا جاتا ہے۔ زیادہ مقبول روایت کے مطابق دیوتا ''را'' نے ''خیپرا'' کا دیوی کا روپ اختیار کر لیا جس میں تخلیق کا مادہ پایا جاتا تھا۔ پھر اُس کے منہ سے یکے بعد دیگرے کائنات تخلیق ہونے، آسمان اور زمین کا کوئی وجود نہ تھا اور نہ ہی زمین پر بسنے والی کوئی ذی حس شے موجود تھی۔ ''را'' کہتا ہے کہ میں نے اُن میں زندگی کی روح نو "Nu" کے ذریعے پھونکی جو کہ بے حس و حرکت پڑا تھا اور جس کے اردگرد پانی کی بے کرانی تھی۔ پھر اُس نے بہت سی اشیاء تخلیق کیں۔ جن میں زمین و آسمان، کائنات کی دوسری چیزیں شامل تھیں۔ پھر خیپرا (Khepra) کے آنسوؤں سے مرد اور عورت پیدا ہوئے اور یہ سلسلہ آگے نباتات اور دیوتاؤں تک جاتا ہے (Spence, 1996, 14-15)۔

یونانیوں کے ہاں بھی اسی قسم کی روایت ملتی ہیں لیکن زیادہ مستند روایت ہسیائیڈ

(Hesiod) سے منسوب ہے جسے یونانی ہیسیو دوس پکارتے ہیں۔اُس کی دو مشہور کتابیں دیوجاتکا (Theognis) اور دھندے اور دیہاڑے (ترجمہ سلیم الرحمٰن) (Wosks and Days) ملتی ہیں ۔ دیوجاتکا میں کائنات کی تخلیق کی کہانی بھی ملتی ہے۔ باقی دیومالاؤں کی طرح اوّلیں وجود (Chaos) انتشار یا ابتری کا تھا۔اس کے بعد گائیا یعنی زمین (Gaia) پھر تارتاروس (Tartarus) یعنی پاتال اور محبت (Eros) تخلیق ہوئے۔ ابتری یا انتشار نے پاتال کے ایک اور خطے ایرے بوس (Erebos) اور رات کو جنم دیا۔ رات نے ایرے بوس سے جفتی کی تو دن اور مکان (Space) پیدا ہوئے۔ گائیا نے اورانوس (Ouranos) آسمان، پہاڑ اور سمندر کو جنم دیا۔ پھر وہ اپنے ہی بیٹے سے ہم بستر ہوئی جس کے نتیجے میں اوکیانوس (دریا جو دنیا کو گھیرے ہوئے ہے اور گیارہ مزید تیتان (Titans) پراتم دیوتا پیدا ہوگئے۔اس طرح یہ سلسلہ آگے تک اولمپیائی دیوتا زیوس تک پہنچا جو بعد کی کہانیوں میں دیوتاؤں کا سردار اور حکمران ہے (Hesoid, 1973, 15) (سلیم الرحمٰن 1992ء، 262-461)۔

لیکن ہندوستانی خصوصاً ویدی نظریہ تکوین کا بیان رِگ وید کے دسویں منڈل کی 129 ویں مناجات میں کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔اپنے متن، ہیئت و مواد کے حوالے سے یہ ایک بے نظیر مناجات ہے:

پہلے کچھ بھی تو نہ تھا، نہ ہستی نہ نیستی
نہ آکاش تھا نہ فضا
تو پھر اس کائنات پر کیسا غلاف تھا
اُس کے نطفے میں کیا تھا
کیا پھر یہ سب پانی میں کہیں گم تھا
نہ وہاں فنا تھی نہ بقا

نہ وہاں دن تھا نہ رات نہ روشنی نہ تاریکی
وہاں صرف وجود تھا خود مکتفی
سوائے اُس کے کچھ نہ تھا نہ اُوپر نہ ورے
پھر تاریکی نے چادر تان لی
اندھیرا ہر شے کو نگل گیا
پھر پانی ہی پانی تھا اور انتشار
اُس میں خلا تھا جو لاشے میں مدفون تھا
پھر اُس نے اپنے بطون سے حرکت پذیری کی
اِس کی بطونی حرکیات اور بے کراں تجرید سے
خواہش نے جنم لیا اور جو کہ جرثومہ حیات ہے
جو پیدا کرتا ہے

دانش مند کہتے ہیں:

''یہ ہستی اور نیستی کے درمیان پہلا نازک رشتہ ہے۔ان چند مثالوں سے یہ کہنا مقصود تھا کہ چینی بھی دوسری تہذیبوں کی طرح اپنا نظریہ تکوین رکھتے تھے۔ سب میں جو مشترک بات پائی جاتی ہے وہ تاریکی، انتشار اور پانی ہے جس کے بعد زندگی وجود پذیر ہوئی۔''

فطرت، بنیادی ضروریات اور محنت

اس سے پہلے ہم چین کے حجری دور پر بات کر چکے ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ انسان کی بنیادی ضرورتوں میں اوّلیں حیثیت خوراک، جنس اور پناہ گاہ یا رہائش کو حاصل ہے تو انسان کا فطرت سے پہلا تقاضا خوراک کا تھا اور اُس کے بعد پناہ گاہ کا، جنسی

ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اوّلیں قدیم دور میں کسی گوشہ تنہائی کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ جنسی اعضا کو چھپانے کے لیے ابھی سماجی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی ایسے ذرائع تھے کہ اُن کو پوری طرح ڈھانپا جا سکتا۔ ابھی تک دنیا کے کٹے ہوئے گوشوں میں مرد اور عورت نیم برہنگی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ہندوستان کے کچھ علاقوں اور بنگلہ دیش کے کچھ قبائل میں عورتیں ابھی تک اُوپر والا حصہ برہنہ رکھتی ہیں۔

جیسا کہ چین کے قدیم صحیفوں میں یہ بات لکھی گئی ہے کہ اوّلیں انسانی بود و باش کا چینی خطہ دریائے ہوانگ ہو (دریائے زرد) کا میدانی علاقہ تھا۔ یہ دریا طغیانی کے دنوں میں آس پاس نئی زرخیز مٹی بچھا دیتا تھا۔ اسی دریا کے ساتھ ساتھ اوّلیں چینی باشندے مغرب سے مشرق کی طرف ہجرت کرتے رہے اور اسی علاقے میں زراعت کے اوّلیں نقوش ملتے ہیں۔

دوسرے ملکوں کی داستانوں کی طرح یہاں بھی زراعت کو پہلے کاشتکار سے منسوب کیا گیا ہے جسے اگنی دیوتا (Lord of Fire) بھی کہا گیا ہے۔ اُسے چینی اپنا ثقافتی ہیرو بھی مانتے تھے لیکن محققین ابھی اس بات پر متفق نہیں ہیں کہ وہ ایک جیتا جاگتا انسان تھا۔ یہ ایک دور کی علامت تھا۔ چینی اُسے پاؤ ہی (Pao Hi) یا فو ہی (Fu Hi) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

عظیم چینی دستاویز کتابِ تغیر (Book of Changes) میں اُن مادی اشیاء کا ذکر ہے جنھوں نے چینی تہذیب کے اوّلیں نقوش اُبھارے۔ اس کتاب کے وقت کا تعین نہیں کیا جا سکا لیکن جن ادوار کا ذکر کیا گیا ہے اُن سے اندازاً وقت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ ا ن میں درج تفصیلات کے مطابق پہلے پہل خوراک کے لیے صرف شکار اور ماہی گیری پر قناعت کی جاتی تھی بعدازاں زراعت کو متعارف کروایا گیا۔ اسی سلسلے میں فو ہی کا کردار سامنے آتا ہے۔ اُس نے انسان کو بہت سے ہنر و فنون سے متعارف کروایا جن میں آگ

کا استعمال، کھانا پکانا اور دوسرے ہنر شامل ہیں۔ اگر ہم دوسری قدیم داستانوں (دیومالاؤں) سے اُس کا موازنہ کریں تو عظیم یونانی کردار پرومیتھیس سے اُس کی مماثلت واضح ہو جاتی ہے۔ ایسکائی لس نے اپنے مشہور ڈرامے پرومی تھیوس رسن بستہ (Prometheus Bound) میں اُن نعمتوں کا ذکر کیا ہے جو اُس نے انسان کو عطا کیں۔ دیوتا یہ نہیں چاہتے تھے کہ انسان اُن سے آزاد ہو کر خود کفیل ہو جائے اس لیے زیوس (Zeus) نے اُسے سزا کے طور پر چٹان پر لٹکا دیا، جہاں گدھ اُس کا کلیجہ کھاتا رہتا تھا۔ دراصل یہ دونوں داستانیں انسانی محنت کو خراج تحسین پیش کرتی ہیں اور علامتی سطح پر کسی سے منسوب کر دی گئی ہیں۔ اس کے بعد یہ کام شین ننگ (Shen Nung) نے اپنے ذمے لے لیا اور اس کام کو آگے بڑھایا۔ میں یہاں موازنے کے لیے ایسکائی لس (Aeschylus) کے ڈرامے رسن بستہ سے چند بند پیش کرنا چاہوں گا تاکہ آپ بھی میرے ساتھ اُن کاوشوں کا لُطف اُٹھا سکیں۔

پرومی تھیوس:

میری خامشی کو
بے ادبی اور گستاخی پر محمول نہ کرو
یہ سوچ کر میرا دل روتا تھا
کہ میں اتنا غضب ناک کیوں ہو رہا ہوں
وہ میں ہوں، صرف میں
جس نے نئے دیوتاؤں کو معتبر کیا
یہ قصہ تو اب پُرانا ہو چکا
اب فانی انسانوں کے دکھوں کی رام کہانی سنو
شروع شروع میں وہ عقل سے عاری تھے میں نے سوچنے کی صلاحیت

عطا کی

میرے ذریعے انہیں دماغ جیسی نعمت ملی

ان باتوں سے میرا مقصد انسان کی تذلیل نہیں یہ تو بس تذکرہ ہے

اُن نیک خواہشات کا جو میرے دل میں ہیں اور ان انعامات کا جو

میں نے انسان کو دیئے۔

ان کی آنکھیں بے بصارت تھیں اور کان سماعت سے محروم

خواب کی طرح ان کی زندگی بے مہار اور بے سمت تھی۔

ان کے پاس نہ تو پکے اور روشن مکان تھے

جو چوب کاری سے مزین ہوتے۔

وہ چیونٹیوں کی طرح ایسے بلوں میں رہتے تھے

جہاں سورج کی روشنی اور گرمی کا گزر نہیں تھا۔

وہ ایسے غاروں میں بستے تھے

جہاں موسم سرما کی آمد

پھولوں سے لدی بہار اور موسم گرما کے سنگ آنے والے مہکتے پھلوں

کا سراغ نہ ملتا تھا۔

وہ ان سب سے ناآشنا تھے

میں نے انہیں ستارہ شناسی کا درس دیا، جو موسموں کا راز داں ہے۔

ستاروں کے طلوع اور غروب کی رمز مشکلہ کی عقدہ کشائی کی

اور علم اعداد جو دانش کے در وا کرتا ہے۔

اس تک ان کی رسائی ہوئی، حرفوں سے لفظوں کی بنت سکھائی

پھر انہیں حافظہ عطا کیا جو سب کچھ رقم کرتا ہے

اورفنون کا تحفظ کرتا ہے۔
پھر میں نے سدھایا
منہ زور حیوانوں کو کہ وہ ہل چلا سکیں
اور انسان کی جگہ مشقت کر سکیں
میں نے منہ زور گھوڑوں کو لگام ڈال کر رتھوں کے آگے جوڑ دیا
رتھ، جن سے امرا کی شان منسلک ہے۔
میرے علاوہ اور کس نے دریافت کیں
سمندر پر رواں بادبانی کشتیاں
جس سے ان کے لیے عقل کے کئی در وا ہوئے
آج خود بے بسی کا شکار ہوں۔

کورس:
تمہارا حال اس طبیب کی طرح ہے
جو اپنا علاج کرنے سے قاصر ہے۔
تم جو دوسروں کی مسیحائی کرتے رہے
آج آشفتہ سر اور بے حال ہو۔
تمہارے پاس اپنی بیماری کا کوئی علاج نہیں۔

ساتواں حصّہ

پرومی تھیوس:
ابھی اور سنو حیرتوں کے منہ کھل جائیں گے
سب سے عظیم تحفہ ان کے لیے علم طب کی دریافت تھا

اگر کوئی بیمار پڑ جاتا۔
کوئی دوا، علاج، تریاق، کوئی مرہم کارگر نہ تھی
ان تدابیر کی محرومی سے وہ ختم ہو رہے تھے۔
پھر میں نے انہیں سکھایا استعمال
جڑی بوٹیوں کا جو بیماری کو دور رکھتی ہیں۔
میں نے ان کے لیے سماوی حقیقتوں کا عقدہ کھولا
جن کا کوئی شمار نہیں، کون جانتا تھا۔
خواب اور حقیقت میں کیا فرق ہے
صدائے غیب کے کیا معنی ہیں۔
مسافتوں کی علامتیں کیا ہیں پرندوں
شاہینوں اور گِدھوں کی پرواز کیوں ہے
ان میں خوش بختی اور بدبختی کے کیا شگون پنہاں ہیں
ان کے ڈھنگ کیا ہیں، ان کی محبتیں نفرتیں کیا ہیں
ان کے غول کیوں جمع ہوتے ہیں۔
قربانی کے وقت انتڑیوں کا سبھاؤ کیا ہوتا ہے
ان کے کون سے رنگ، شکل اور نرماہٹ
دیوتاؤں کو بھاتی ہے
روغنیات میں گوشت کو کیسے سجایا جاتا ہے۔
قربان گاہ کے آتش کدے کے لیے ران کیسے پیش کی جاتی ہے
دیوتاؤں کے حضور
میں نے انہیں بتایا

اندھیرے سے باہر آنے کا راز
آگ کی علامتیں ان پر واضح نہ تھیں
حتیٰ کہ میں نے ان پر افشا کیں
زمین کی گہرائیوں میں مدفون تھے
انسان کے لیے بیش بہا خزانے
تانبا، لوہا، سونا اور چاندی
کون دعویدار ہے ان کی دریافت کا
میں نے پوشیدہ خزانوں کے منہ کھولے
ایسا کون ہے جو یہ دعویٰ کرے۔
جس نے سکھلائے انسان کو سب فنون اور بتایا اشیاء کا استعمال۔

فوہی کے زمانے کا تعین 2953 سے 2838 ق م تک متعین کیا جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں اُسے چینوں کا حضرت آدم بھی گردانا جاتا ہے۔ ایک حوالے سے اُس کا موازنہ بابلی دیومالائی کردار اِیا (Ea) سے بھی کیا جاتا ہے۔ اِیا جو دریائے فرات کی گہرائیوں میں چھپا ہوا تھا۔ بابلیوں کو تمام ہنر سکھلانے والا اور فنون کی تربیت دینے والا کہیں خلیج فارس میں رہتا تھا اور ہر روز اریدو (Eridu) کے باشندوں کو ہدایت دینے باہر آجاتا کہ نہریں کیسے بنانی ہیں، فصلیں کیسے اگانی ہیں، دھاتوں کو کیسے استعمال میں لانا ہے، ظروف سازی اور اینٹیں بنانے کا ہنر کیسے آتا ہے، عبادت گاہوں کی تعمیر کیسے ہوتی ہے۔ وہ دستکاری کا دیوتا تھا۔ مناجات اُس کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ وہ ہر شے جانتا تھا۔ اُس نے اُنھیں حروف سے روشناس کیا۔ ریاضی کی ابجد سکھلائی۔ ہندوستان کے دیوتا منو کی طرح قانون وضع کرنے کا سہرا بھی اُس کے سر ہے۔ مصری دیوتا Ptah بھی انہی خصوصیات کا حامل تھا۔

ہان دور کی ایک دستاویز پوہوتنگ (Pu Hu Tung) میں لکھا ہوا ہے:

''قدیم دور میں ہر طرف ابتری تھی۔ مردوں کو صرف اپنی ماؤں کی پہچان تھی۔ کوئی اخلاقی ضابطہ یا قانون نہیں تھا۔ جب اُنھیں بھوک لگتی تو شکار کرتے اور کچا گوشت کھال سمیت کھا جاتے۔ حتیٰ کہ خون بھی پی جاتے۔ جسم کو وہ کھالوں اور گھاس پھوس اور نرکلوں سے ڈھانپتے تھے۔''

اس نظم کا بیان کچھ یوں ہے:

- وہ ہر انسانی خصوصیت سے عاری مانندِ حیوان تھے۔
- دنوں اور چیزوں کا حساب رسیوں پر گانٹھیں مار کر کرتے۔
- اُس نے اُنھیں اعداد سے روشناس کیا۔
- اُس سے منسوب شش رخی نظم (Hexagram) آٹھ اشیاء میں طلسمی قوت پنہاں دکھائی گئی ہے۔
- اُن میں (1) آسمان، (2) پانی، (3) آگ، سورج، (4) گرج، (5) ہوا اور لکڑی، (6) پانی جیسے بارش میں ندی اور چشموں میں چاند، بادل، پہاڑی، زمین۔

میں نے یہ موازنہ اس لیے پیش کیا کہ پُرانی داستانوں یا دیومالاؤں میں ایسی بہت سی زقندیں لگائی گئیں جہاں دیوتاؤں سے بہت سی باتیں اور ہنر انسانوں تک منتقل ہوئے۔ یہ انسانی محنت کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ دیوتاؤں نے کہیں تو اس کا بُرا منایا جیسا کہ بعدازاں پرومی تھیوس کے ساتھ سلوک روا رکھا گیا۔ ہم اس پر بھی بات کریں گے کہ چین کی اوّلیں داستانوں میں زمین سے بالا قوتوں کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جو دنیا کے باقی خطوں کی داستانوں میں ملتی ہے۔

اوّلیں سماجی نظام

داستانوں میں رقم ہے کہ دوسرے قدیم معاشروں کی طرح چین میں پہلے خاندانی گروہوں میں مادرسری نظام (Matriarchal) نے جنم لیا۔ اس کی اپنی معاشی اور سماجی وجوہات تھیں۔ سب سے پہلی وجہ تو یہ تھی کہ نجی جائیداد نے ابھی جنم نہیں لیا تھا اور زوجگی (Matrimony) بھی ابھی متعارف نہیں ہوئی تھی۔ ایک عورت بیک وقت کئی مردوں کے ساتھ جنسی روابط رکھتی تھی جسے عام اصطلاح میں کثرت شوہری (Polyandry) کہا جاتا ہے۔ اس لیے بچے صرف ماں ہی کو جانتے تھے، باپ کی شناخت ناپید تھی۔ معاشی سطح پر مارکسی اصطلاح میں اسے قدیم اشتمالی نظام (Primitive Communism) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شکار اور جمع داری (Gathering) کا دور تھا جہاں شکار اور جمع کردہ جڑی بوٹیوں اور پھلوں کو خاندان کے لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اس نظام کو مادرسری نظام یعنی ''مادریت'' سے بھی منسوب کیا جاتا ہے۔ ''مادریت'' کی اصطلاح میں نے خود وضع کی ہے۔ مادرسری نظام کی جگہ یہ ایک لفظ پر مبنی اصطلاح زیادہ بہتر لگتی ہے۔ اسے انگریزی میں Malriarchate بھی کہا جاتا ہے۔ چینی ناموں میں ماں کے نام کو اب بھی فضلیت حاصل ہے اور بعض رسموں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ زوجگی کا رواج شروع ہونے کے بعد مرد بیاہ کر عورت کے خاندان میں لایا جاتا تھا۔ مادریت کا یہ رواج چین کے میاؤ (Miao) قبائل سے وابستہ ہے جو تاریخی وجوہات کی بنا پر ہجرت کرتے ہوئے زیادہ تر جنوبی علاقے میں چلے گئے اور دریائے ینگ سی کے ساتھ ساتھ میدانی علاقوں میں آباد ہو گئے۔ کثرت شوہری (Polyandry) کی رسم آج بھی ہمالیہ کے ترائی کے علاقوں ہندوستان، بھوٹان اور آس پاس کے علاقوں میں رائج ہے۔ ہندوستان کے صوبہ کیرالا میں بھی مرد شادی کے بعد عورت کے خاندان سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ کثرت شوہری میں ایک عورت کا ازدواجی

تعلقات کے حوالے سے ایک سے زیادہ شوہروں سے اختلاط ہوتا ہے۔ مہابھارت میں اس کی مثال دروپدی کی پانچوں پانڈو بھائیوں کے ساتھ شادی سے ملتی ہے۔ عمومی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان میں یہ رسم زردنسل ہمالیہ پار سے لے کر آئی۔ ہندوستان میں ساکا قوم میں یہ رسم عام تھی۔ ساکاؤں کے ہاں اس رسم کے بارے میں ہیروڈوٹس(Herodotus) نے اپنی تواریخ میں بہت ذکر کیا ہے۔

☆.....☆.....☆

یورپی مرکزیت کا نقطہءنظر

ڈاکٹر مبارک علی

یورپی مرکز سوچ رکھنے والے مورّخین یورپ کے عروج کو اُس کے اندرونی وسائل کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے بیرونی اثرات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ اسے یورپ کی معجزہ نمائی کہتے ہیں۔ ایک ایسا معجزہ جو دوسری اقوام کے مقابلے میں ایک غیر معمولی قابلیت اور توانائی رکھنے والے یورپی لوگوں نے رونما کیا۔ اس حوالہ سے Wealth and Poverty of Nations کا مصنف ڈیوڈ لانڈز بھی تاریخ کے یورپی مرکز نقطہ نظر کا نمائندہ ہے۔ یورپ کے عروج کا جائزہ لیتے ہوئے وہ دلیل دیتا ہے کہ سب سے پہلے یہاں کی آب و ہوا اور مختلف قدرتی عوامل نے اس کی ترقی اور بڑھوتری میں اہم حصہ لیا۔ گرم آب و ہوا رکھنے والے ممالک میں کیڑوں، مکوڑوں اور جرثوموں کی تعداد میں بے حد اضافہ ہو جاتا ہے جس سے بیماریاں اور وبائیں پھوٹ پڑتی ہیں جو انسانوں اور حیوانوں کو یکساں طور پر ہلاک کرتی ہیں۔ اس کے برعکس یورپ کی آب و ہوا چونکہ بہت سرد ہے۔ اس لئے بیکٹیریا اور دوسرے جراثیم بغیر کوئی نقصان پہنچائے برف تلے دبے رہتے ہیں۔ مصنف کے مطابق، جب طاعون کی وباء مشرق سے آ کر پورے یورپ میں پھیل گئی تو یہاں کے رہنے والوں نے خاموشی سے یہ مصیبت جھیلنے کی بجائے اس کا علاج دریافت کرنے کی کوششیں کیں، اور اسی

اندازِ نظر کی بنا پر وہ بیماریوں کو قابو میں لانے کے قابل ہو گئے۔

مشرق اور مغرب کے بیچ ایک اور فرق یہ تھا کہ مشرق میں پانی کے ذخائر ریاست کے اختیار میں تھے۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ کسان اور زمیندار دونوں ریاستی قوت کا سہارا لینے پر مجبور تھے۔ اسی عمل نے مشرقی مطلق العنانیت کو جنم دیا جس سے حکمران بہت زیادہ طاقت ور تھے اور بیوروکریسی کے ذریعے پانی کی تقسیم کا بندوبست کرتے تھے۔ جبکہ مغرب میں ایک تو پانی وافر مقدار میں تھا اور دوسرا ریاستی اختیار سے آزاد تھا۔ اس عمل نے زمینداروں اور کسانوں کو آزادی سے ہمکنار کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ جاگیرداروں اور شاہی طبقہ میں ایک مسلسل کشمکش پائی جاتی تھی۔ مزید برآں، چونکہ یہاں کے مویشیوں کے لئے وافر خوراک میسر تھی اس لئے وہ صحت مند، توانا اور زیادہ بارآور تھے۔ ایک اور امتیازی خوبی یہ تھی کہ تاخیر سے شادی کرنے کی وجہ سے انہوں نے آبادی پر قابو پا لیا۔ مشرق میں جہاں آبادی بے تحاشا بڑھ چکی تھی، حکمران لوگوں کو عظیم الشان یادگاریں تعمیر کرنے پر جبری طور پر مجبور کرتے تھے، مثلاً اہرامِ مصر یا عظیم دیوارِ چین۔

لانڈز کے مطابق نجی جائیداد کے ضابطے نے یورپ کے عروج میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ وراثتِ اکبر کے قانون کی بنیاد پر جائیداد وراثت میں بڑے بیٹے کو منتقل ہوتی تھی۔ اس قانون نے جائیداد کو سالم و ثابت رکھا مستقل طور پر طبقہ امراء اقتدار میں رہا۔ بڑے بیٹے کے علاوہ باقی بچوں کو روزگار کے لئے کام کرنا پڑتا تھا۔ کچھ تاریخ دان اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس نئی نسل نے آزادانہ طور پر اپنی جائیداد تشکیل دینے کے لئے مواقع اور مقامات دریافت کئے۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے نئے تجارتی راستے دریافت کئے نیز نئی نوآبادیوں کو تسخیر کیا۔

سلطنتِ رُوما کے زوال کے بعد شہر تو گویا ویران ہو گئے۔ طبقہ امراء شہروں کو غیر محفوظ پا کر دیہات منتقل ہو گیا۔ اس نے تجارت اور درآمد، برآمد کو بری طرح متاثر کیا۔ مزید یہ کہ

ثقافت کی نمورُک سی گئی۔ چودھویں صدی میں، حکمرانوں نے ایک بار پھر اپنی توجہ شہروں کی بنیاد ڈالنے پر ڈالی جس سے صنعت وتجارت کو نئی قوت ملی اور تاجر طبقے کو ایک باعزت مقام نصیب ہوا۔

فرانسیسی مورخ بروڈیل کے مطابق گو کہ یہ مختلف ممالک میں تقسیم ہے لیکن یورپ کی اہمیت کی بنیاد یہ ہے کہ ایک وحدانیت ان سب ممالک کو ہم آہنگ کر رہی ہے۔ کوئی بھی تکنیکی وسائنسی ایجاد اور ثقافتی وفلسفیانہ بالیدگی تیزی کے ساتھ تمام یورپی ممالک میں پھیل جاتی ہے اور عظیم تر یورپی تہذیب کا حصہ بن جاتی ہے۔ ایسی نادر صورتِ حال کسی اور براعظم میں نہیں ملتی۔ مورّخین کے ایک طبقے کے مطابق یورپی تہذیب کا دوسرا پہلو جو اسے دوسری تہذیبوں سے ممتاز کرتا ہے، انفرادیت (Individualism) ہے۔

بھارتی ماہرِ عمرانیات ستیش سبروال جس زاویہ سے یورپی تہذیب ایک مختلف اہمیت کا حامل سمجھتا ہے وہ اس کی دستاویز کاری کی روایت وتہذیب ہے۔ ہر اہم بات کو تحریری شہادتوں میں محفوظ کرنا ایک روایت تھی۔ قرونِ وسطیٰ کے عہد میں، خانقاہوں میں مقیم راہب ہر واقعے کو تحریری طور پر محفوظ کر لیتے تھے۔ وہ پرانے مخطوطوں اور مسودوں کی نقلیں تیار کر کے محفوظ کر لیتے تھے۔ یہ تحریریں تحریکِ احیائے علوم کے انسان دوست مفکرین کے لئے ایک قیمتی انکشاف ثابت ہوئیں جنہوں نے ان خانقاہوں کی لائبریریوں سے کلاسیکی ادب کے شہ پارے دریافت کئے اور انہیں دوبارہ سے بہتر حالت میں لا کر اپنے استعمال میں لائے۔

یورپ مرکز تصور کے جواز میں مورّخین کا وہ گروہ اعتراض کرتا ہے جو اس کا تجزیہ وسیع تر تناظر میں کرتا ہے۔ ان تاریخ دانوں کے مطابق بیرونی عوامل نے یورپی نمو اور چڑھاؤ میں اہم کردار ادا کیا اور تمام تر مندرجہ بالا اندرونی عوامل سے زیادہ ان کو شمار میں لانا چاہئے۔ ان تاریخ کے ماہرین کی بنیادی دلیل یہ ہے کہ امریکہ کی دریافت اور اس کے قدرتی وسائل کے حصول نے یورپ کی تقدیر بدل دی۔ ورنہ تو 1492ء سے پہلے ایشیائی اور

افریقی ممالک بھی اُتنے ہی ترقی یافتہ تھے جتنا کہ یورپ۔ برازیل کی کانوں سے نکلنے والے سونے چاندی نے یورپ کو اُن وسائل سے مالا مال کیا جن کی مدد سے وہ ہندوستان اور مشرقِ بعید سے مصالحہ جات خریدنے کے قابل ہوئے۔ مزید برآں، اُنہوں نے اپنی اضافی آبادی اس نئی دریافت کردہ دنیا میں منتقل کر دی جس سے اُن کے سماجی اور معاشی مسائل کم ہو گئے۔ امریکہ سے لائے گئے آلو، ٹماٹر اور تمباکو اُن کی معیشت کے لئے ایک سہارا ثابت ہوئے۔

تاریخ کے یہ ماہرین اس بات کی نشاندہی بھی کرتے ہیں کہ مشرق کے ساتھ تجارت اور اُس سے حاصل ہونے والے منافع نے سرمائے کی وہ بڑھوتری پیدا کی جس کے نتیجے میں صنعتی انقلاب رونما ہوا جو بعد ازاں نوآبادیاتی نظام کے آغاز کے لئے عمل انگیز عنصر کی حیثیت اختیار کر گیا۔ لہٰذا نظرِ ثانی کے خواہش مند ان تاریخ دانوں کے مطابق یورپ کا عروج کوئی معجزہ نہیں بلکہ یہ اندرونی اور اس کے ساتھ ساتھ بیرونی قوتوں کے عمل کا نتیجہ تھا۔ یورپ مرکز سوچ آج تک تاریخی اور سیاسی نظریہ سازوں کو اپنے بخار میں مبتلا کئے ہوئے ہے اور یہ سوچ بہت سی مغربی حکومتوں کی خارجہ پالیسیوں میں بھی اپنا مظاہرہ کرتی نظر آتی ہے۔ اس تمام تر صورتِ حال کی جڑیں اُس تاریخی تحقیق سے سر اُٹھاتی ہیں جس میں یورپ کی ترقی کو ایک معجزہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس یورپ مرکز تناظر پر نظرِ ثانی کرنے کے لئے یہ ایک موزوں ترین وقت ہے۔

☆.....☆.....☆

تاریخ سے چشم پوشی

ڈاکٹر مبارک علی

اگر عمومی دانشمندی سے کام لیتے ہوئے تاریخ پر نظر ڈال کر ہم اُن غلطیوں کے ارتکاب سے محفوظ رہ سکتے ہیں جو ماضی میں ہمارے پیش رو افراد نے کر ڈالیں تو یہ مکمل طور پر درست نظریہ نہیں ہے۔ یہ بات تو درست ہے کہ ماضی کی تاریخ سے روشناس ہو کر ہم انسانی فطرت کو سمجھ سکتے ہیں اور اس کی مدد سے موجودہ مسائل کا حل تلاش کر سکتے ہیں، تاہم کچھ لوگ، خصوصاً ہر قبیل کے سیاستدان موجودہ مسائل کا حل اُنہیں موجودہ حالات و حقائق میں امتیازی طور پر جا پذیر کر کے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس یقین کے ساتھ کہ تاریخ سے سیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کوئی بھی ماضی کو مکمل طور پر نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ایسی ہی ایک مثال جس میں ماضی کی نظیر کو پسِ پُشت ڈال دیا گیا معاہدہ ورسائی ہے۔ اس کانفرنس میں Congress of Vienna کا مصنف نوجوان برطانوی مورخ چارلس ویبسٹر (1886-1961) بھی موجود تھا۔ ورسائی کے معاہدے سے قبل نپولین کی شکست کے بعد بہت سے معاہدے طے کئے جا چکے تھے۔ نپولین نے یورپ کا نقشہ ہی بدل ڈالا تھا اور پھر اُسے اپنے عزائم کے مطابق شکل دی۔ سب سے پہلے تو اُسے 1814ء میں شکست ہوئی اور سینٹ البا میں جلاوطن کر دیا گیا۔ وہاں پر وہ قید نہ رہ سکا اور فرار ہونے میں کامیاب

ہوگیا۔فرانسیسی فوج نے اُس کا استقبال کیا اور وہ ایک بار پھر 1815ء میں واٹرلو کے مقام پر جنگ آزما ہوا جس میں اُسے پھر سے شکست ہوئی۔ اس مرتبہ اُسے سینٹ ہیلینا میں نظر بند کیا گیا جہاں اُس کے فرار کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔

آسٹریا کا چانسلر میٹرنش جس نے یورپ کی تشکیل نو کی نگرانی کرتے ہوئے تمام تر اقدامات کئے، ایک قدامت پسند تھا اور کسی بھی انقلابی رجحان کو روکنا چاہتا تھا۔ ویانا میں موجود تمام رہنماؤں کا بنیادی مقصد فرانس کو زیر عتاب لانا نہیں تھا۔ اُنہوں نے عوام کے تمام مصائب کا ذمہ دار نپولین کو ٹھہرایا اور اُسے ہی نظر بند کیا۔ فیصلہ کیا گیا کہ فرانسیسی بادشاہ کو بحال کر دیا جائے اور عام فرانسیسیوں کو کانگریس کی کارروائیوں میں حصہ لینے کی اجازت حاصل ہو۔اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ کی اعتدال پسند قوتوں نے علاقے میں امن کو یقینی صورت دی اور انقلابی تحریکوں کو بھی روک دیا۔ اس نرم مزاجی اور بردباری نے نا صرف اس بات کو یقینی بنایا کہ انصاف کے تقاضے پورے ہوں بلکہ فرانسیسی قوم کو بھی بحالی کے راستے پر پھر سے متحرک کر دیا۔نوجوان مورخ ویبسٹر نے ویانا کی کانگریس کا حوالہ دیتے ہوئے ورسائی میں جمع حکمرانوں کو نصیحت کی کہ وہ جرمنی کی قسمت کا کوئی یقینی فیصلہ نہ کریں نیز اُن سے التجا کی کہ وہ جرمنی کے ساتھ فراخ دلی سے پیش آئیں۔ اُس کے مشورے کو نظر انداز کرتے ہوئے حکمرانوں نے ناقابلِ برداشت سلوک پر مبنی کڑی شرائط جرمنی پر عائد کرنے کا فیصلہ کیا۔اس ملک کو بہت بڑی رقم تاوانِ جنگ کے طور پر ادا کرنا پڑی جس نے جرمنی کی معیشت کو برباد کر دیا۔ مزید برآں سزا کے طور پر اپنا کچھ علاقہ بھی اسے اتحادیوں کے حوالے کرنا پڑا۔ جب اس معاہدے کی شرائط تیار ہوچکیں تو تمام راہنماؤں کی موجودگی میں جرمنی کے مندوبین کو طلب کیا گیا۔ اُنہیں بیٹھنے کی اجازت نہیں دی گئی اور مجرموں کی طرح کھڑا رکھا گیا۔ اُنہیں اپنی بات کی وضاحت کا کوئی موقع نہیں دیا گیا اور معاہدے پر دستخط کرنے یا جنگ کے لئے تیار رہنے کی چتاونی دی گئی۔ ذلت اور ہتک کے مارے ہوئے

جرمن نمائندوں کے پاس اس معاہدے پر دستخط کرنے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا اور یوں یہ معاہدہ جرمنی میں جلد ہی غیر مقبول ہو گیا۔ جرمن عوام نے اسے ڈِکٹاٹ کا نام دیا۔ جب ہٹلر اقتدار میں آیا تو اُس نے اس معاہدے کے خلاف جرمنوں کے قوم پرست جذبات کو تحریک دی۔ جرمنی اپنی عزتِ نفس اور توقیر پھر سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جب ہٹلر نے اس کی یقین دہانی کرائی تو جرمن قوم نے اُس کی حمایت کی۔ اُس نے جلد ہی نا صرف ملک کو اقتصادی طور پر مضبوط کر دیا بلکہ معاہدے کے نتیجے میں چھینا ہوا علاقہ بھی واپس لے لیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران فرانس پر قبضے کے بعد، ہٹلر نے فرانس کو ایسے معاہدے پر مجبور کیا جو سراسر جرمنی کے حق میں تھا اور یوں ایک طرح سے جرمنی کی عزتِ نفس بحال ہوئی۔ مورّخین جواز فراہم کرتے ہیں کہ معاہدہ ورسائی نے پوری جرمن قوم کے ساتھ جنگی جرائم میں ملوث مجرموں کا سلوک کر کے دوسری جنگِ عظیم کی بنیاد رکھی۔ اگر جرمنی کے ساتھ بھی وہی سلوک روا رکھا جاتا جو فرانس کے ساتھ ویانا کی کانگریس کے بعد کیا گیا تو یورپ میں امن قائم رہ سکتا تھا۔ برطانوی مورّخ اے۔ جے۔ پی ٹیلر اپنی کتاب The Origin of Second World War میں بالکل ٹھیک نشاندہی کرتا ہے کہ معاہدہ ورسائی نے جرمنی کی تشکیل کچھ اس طریقے سے کی کہ جنگ ناگزیر ہو گئی۔ اگر ہٹلر نہ بھی ہوتا، جرمنی کسی بھی حکمران کے زیرِ تحت ضرور جنگ کرتا تاکہ اس معاہدہ ورسائی کو منسوخ کیا جا سکے جس نے اس ملک کی انتہائی تذلیل کی تھی۔ لہٰذا، ہٹلر کو اس جنگ کا ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایک ایسے ماحول میں مصروفِ کار تھا جو اُس کی انتہا پسندانہ لفاظی کے لئے معاون تھا۔

تاہم دوسری جنگِ عظیم کے بعد جرمنی کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا گیا جو معاہدہ ورسائی کے نتیجے میں روا رکھا گیا۔ اس کے برعکس، امریکہ نے جرمنی کی معیشت کی تشکیلِ نو کے لئے بہت بڑی رقم امداد کے طور پر جمع کی۔ یہ عمل اس ملک پر روسی عمل دخل روکنے کے لئے کیا

گیا۔ جرمنی نے جلد ہی اپنی تعمیرِ نو کی اور مغربی سرمایہ دارانہ بلاک میں شامل ہو گیا۔ نرم مزاجی کا یہی سلوک جاپان سے بھی کیا گیا جس نے اس کی بحالی کے عمل کو آسان بنایا بعد میں جاپان کو امریکہ کا بین الاقوامی شراکت دار بنا دیا۔ ان دونوں ممالک کا مشکل حالات میں مدد کرنے کا مقصد ایک ہی تھا، انہیں سرمایہ دارانہ نظام میں شریک کر کے روس کے خلاف استعمال کیا جائے۔ وہ سفارت کار جنہوں نے معاہدہ ورسائی پر دستخط کرتے ہوئے تاریخ کو نظر انداز کر دیا ایک سنگین غلطی کے مرتکب ہوئے جس نے دوسری جنگِ عظیم کی صورت میں ایک زیادہ بڑی تباہی کا راستہ ہموار کیا۔ اُنہوں نے اس معاہدے کے بعد آخر سبق سیکھ ہی لیا اور بعدازاں جرمنی اور جاپان کے ساتھ بہتر راہِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اچھا سلوک کیا۔

☆.....☆.....☆

دانشور اور سماج

ڈاکٹر مبارک علی

لِکھاریوں کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ جو اپنی تحریروں کے ذریعے مروجہ نظام کی حمایت کرتے ہیں اور اُس کے جواز کو ثابت کرتے ہوئے اُس میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔ دوسری طرف ایسے لوگ ہیں جو معاشرے کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے تازہ خیالات پیش کر کے اُس کی تشکیل نو اور اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔

دانش وروں کا فرض سماجی اور سیاسی شعور کی تخلیق ہے اور لوگوں کو عزتِ نفس اور آبرومندی کا احساس دلانا ہے۔ یہ بھی اُن کا فرض بنتا ہے کہ وہ موجودہ نظام سے سمجھوتہ کرنے کی بجائے بے انصافی، استبداد اور استحصال کے خلاف آواز بلند کریں۔ تاریخ کے ہر دور میں ایسے دانش ور ملتے ہیں جنہیں آمروں اور مطلق العنان حکمرانوں سے مخالفت کی بھاری قیمت چکانا پڑی۔ انہوں نے قید و بند اور تشدد برداشت کیا لیکن اپنے خیالات اور اصولوں پر ڈٹے رہے۔ اس نے تاریخ کے دھارے کو بدل ڈالا اور ایسے دانش ور امر ہو گئے۔ Intellectual یا دانشور کی اصطلاح اُنیسویں صدی کے فرانس میں اُن لِکھاریوں، فن کاروں، فلسفیوں اور صحافیوں کے لئے متعارف ہوئی جنہوں نے ایک جماعت کے طور پر ازکارِ رفتہ اور متروک قدروں پر اعتراض کیا جو معاشرے میں عام تھیں اور اس کے ساتھ ہی ایک متبادل نظام تجویز کیا جو اس

فرسودہ معاشرتی بناوٹ کی تشکیل نو کر سکے۔ اس لحاظ سے اُن لوگوں کو Intellectual یا دانشور کہنا غلط ہے جو حسبِ سابق استحصالی صورتِ حال کی حمایت کریں اور ذاتی مفادات کے حصول کے لئے حکمران طبقات کی کاسہ لیسی کریں۔

اگر ہم یورپی تاریخ کا جائزہ لیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ دانش وروں نے مثبت اور تعمیری کردار ادا کیا۔ اٹھارہویں صدی کے فرانس میں فلسفیوں کے ایک گروہ نے نا صرف پرانے نظامِ آگہی پر اعتراض کیا بلکہ لوگوں کا ذہنی میلان بھی بدل ڈالا۔ اُنہوں نے فلسفہ سے لے کر ڈراموں، افسانوں، ناولوں، تاریخ کے سنجیدہ موضوعات، قانون اور تہذیب سمیت ادب کی تمام ہیئتوں اور موضوعات میں شرکت کی۔ اُن کی سب سے اہم شرکت انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت تھی، اُس وقت کا ایک انوکھا خیال جس کے ذریعے علم و آگہی اکٹھی کی ہوئی صورت میں فراہم ہو سکے۔ لِکھاریوں کے اس گروپ کے اثرات بہت گہرے تھے۔ فرانسیسی انقلاب کے راہنماؤں نے اُن کے خیالات اور فلسفہ ''انسانی حقوق کے اعلان'' اور مختلف آئین بنانے کے لئے مستعار لئے۔ یورپی دانشوروں نے اپنے تخلیقی خیالات ہی ایسے تاریخی سنگم پر بیان کئے جب جب معاشرہ تبدیلی کے لئے مکمل طور پر تیار ہوتا تھا۔ فرانسیسی انقلاب ایک ایسا واقعہ تھا جس نے یورپی تاریخ کا رُخ تبدیل کر کے رکھ دیا۔ دانش وروں نے اس طرح کی کسی بھی تحریک (کے نتائج کا) تعین کیا اور اپنی تحریروں کے ذریعے لوگوں کی راہنمائی کی۔ صنعتی انقلاب ایک اور اہم ترین واقعہ تھا جس نے سماج پر بہت گہرا اثر ڈالا اور طبقات کے درمیان تعلق کو یکسر تبدیل کر دیا۔ جب جرمنی نے نپولینیائی جنگوں کے نتیجے میں اذیت جھیلی اور اُسے شکست اور ذلت کا سامنا کرنا پڑا تو یہ جرمن دانشور ہی تھے جو اسے اس بحران سے نکالنے کے لئے آگے بڑھے۔ یوہان ہرڈر اور فیشٹے نے لوگوں میں قومی شعور بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا جس کے نتیجے میں ایک مستحکم جرمن جذبہ قومیت کی بنیاد پڑی۔ لہٰذا دانش وروں نے معاشرے کی کیفیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے راہنمائی کی اور نئے نظاموں کی حرکیات کے بارے میں نشاندہی

کی۔ معاشرے کی اصلاح کے لئے دانش وروں نے روشن خیالی، روحانیت، قوم پرستی، اشتراکیت اور تانیثیت جیسی مختلف تحریکوں کا آغاز کیا۔ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم نے ان تحریکوں کو شدید دھچکا لگایا اور فن وادب میں بالکل مختلف تحریکوں نے جنم لیا جیسا کہ وجودیت وغیرہ۔

پرنٹنگ پریس کی ایجاد اور اس کے نتیجے میں اشاعتی مرکزوں کی آمد آمد نے پندرہویں اور سولہویں صدی میں یورپی دانشمندوں میں آزادی کی ایک لہر دوڑا دی۔ اس غیر معمولی پیش قدمی نے خریداروں کے ایسے طبقے کی بنیاد ڈالی جو کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے۔ اخباروں، رسالوں، جریدوں، کتابچوں اور کتابوں کی اشاعت نے لِکھاریوں کو معاشی طور پر خودکفیل کر دیا۔ نشاۃِ ثانیہ کے دور کے معروف مصنف ارا سمس کی گزر اوقات بھی اپنی تحریروں سے ہوتی تھی۔ تعلیم کے پھیلنے اور عوامی لائبریریوں نیز مطالعہ گاہوں کے قیام کے ساتھ ساتھ کتابوں اور تعقلی تحریکوں کے بارے میں عوامی آگہی کی مانگ میں بھی یک بار اضافہ ہوا۔ اس عمل نے لِکھاریوں کی تقدیر بدل کر رکھ دی۔ وہ معاشرے میں اپنے عالمانہ اور تعقلی کردار کی وجہ سے ایک انتہائی باعزت مقام پانے لگے۔

ان دانشوروں کے کردار پر نظر ڈالتے ہوئے ہمیں پتا چلتا ہے کہ وہ آزاد دقیقہ شناس، تخلیقی اور اپنے معاشرے کے بارے میں حساس تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سماج کی بناوٹ میں تبدیلی لانے کے اہل تھے اور اپنے اصلاحی و اختراعی خیالات کی بنیاد پر معاشرے کے سُدھار میں کردار ادا کر سکتے تھے۔

دانشوروں کے اس ناگزیر کردار کو جو اُنہوں نے تمام تر تاریخی عمل میں ادا کیا ہم یہ سوال اُٹھا سکتے ہیں کہ پاکستان کے مسائل میں گھرے معاشرے کے لئے دانشوروں کا کردار کیا ہونا چاہیئے؟ اول تو یہ کہ دانش وروں کے زُمرے میں ہمارے ہاں صرف شاعر، افسانہ نویس اور ناول نگار ہی پائے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں قابلِ ذکر فلسفی، ماہرِ عمرانیات، ماہرِ بشریات اور نفسیات داں کم کم ہیں۔ خیر اب تو صحافی بھی دانش ور برادری کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔

دانش وروں کی یہ پوری جماعت سماجی، ثقافتی، سیاسی اور معاشی قدروں پر کسی قسم کی تنقید یا نکتہ چینی پر مائل نہیں ہے۔ چند ہستیوں کے استثناء کے ساتھ، ان دانش وروں کی اکثریت مروجہ خیالات وروایات کے حق میں ہے اور مالی مفادات کے بدلے اپنے علم وآ گہی کی فروخت کے لئے تیار ہے۔ اس طرح کے موقع پرست سیاسی تبدیلی کے ساتھ ہی اپنے خیالات بھی تبدیل کر لیتے ہیں۔ مارشل لاء کے دور میں یہ فوجی حکومت کے لئے موافق ہو جاتے ہیں اور جمہوری حکومتوں کے دوران یہ جمہوریت کے معرکہ مار بن جاتے ہیں۔ انہی حربوں کے ذریعے یہ ایک کے بعد دوسری حکومت میں اعلیٰ عہدے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں یہ انتہائی بے شرمی سے ہر حکومت کی کاسہ لیسی کرتے ہیں اور اُس اثر ورسوخ کی بنیاد پر جو یہ پیشہ اُنہیں عطا کرتا ہے معاشرے میں اپنے اعلیٰ مقام سے خوب استفادہ کرتے ہیں۔

المیہ یہ ہے کہ اُن کا یہ کردار اچھی طرح سے جاننے کے باوجود معاشرے میں اُن کی خوب عزت کی جاتی ہے۔ مختلف ادبی تقاریب میں صدارت کے مقام کے لئے انہی کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ یہ بات نا صرف ان نام نہاد دانش وروں کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کرتی ہے بلکہ سوسائٹی میں موجود ریاکاری بھی سامنے آ جاتی ہے۔ یہ دانش ور نازک اور خطرناک ترین صورتِ حال میں بھی خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ جب سابقہ مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کی گئی تو یہ خاموش رہے اور اس کی کوئی مذمت نہیں کی۔ یہی خاموشی ہمارے دانشوروں کے دیوالیہ پن کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

دوسری طرف جو چند افراد یہ طفیلی کردار ادا کرنے سے انکار کرتے ہوئے معاشرے پر اعتراض اُٹھاتے ہیں اور کسی تخلیقی قدر کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں اُنہیں تحقیر کی نظر سے دیکھ کر ایک کنارے پر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ ہمارا معاشرہ گراوٹ اور تذلیل کی صورت میں اس کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔

☆.....☆.....☆

تاریخ کے بنیادی ماخذ

شاہ عالم ثانی کے عہد کا دہلی دربار

مصنّفین: انتھنی پولیر، لوئی لوراں دولیسی

ترجمہ: نصیب اختر

مارچ 1967ء کو کراچی سے شائع ہوئی!

بادشاہ کے مقبوضات اور اس کے ہمسائے

(مورخہ 28- جولائی 1775ء)

بادشاہ کے مقبوضات کے شمال اور شمال مغرب میں سکھ ہیں، شمال مشرق اور دوآبہ میں ایک بڑا قطعہ زمین ضابطہ خاں کے قبضہ میں ہے جو بادشاہ کے مقبوضات میں شامل تھا مگر اب آخری معاہدے کی رو سے قطعی طور پر اسے دیدیا گیا ہے مشرق میں اس کی سرحدیں اودھ سے ملتی ہیں اور باقی دوسری اطراف پہلے کی طرح اب بھی نجف خاں کے علاقوں سے گھری ہوئی ہیں ان مختلف طاقتوں میں سے ہر ایک شاہ عالم کو بادشاہ تسلیم کرتی ہے اور اس کے شایان شان القاب سے یاد کرتی ہے مگر سب یکساں طور پر اسے دبانے پر مائل نظر آتی ہیں۔ اس کی امداد و اعانت کے بجائے کسی طرح اس کا کچھ حصہ چرانے اور اسے مصائب میں مبتلا کرنے کے علاوہ کچھ نہیں سوچتیں۔

ہمسائے۔ آصف الدولہ

آصف الدولہ بھی محض دکھاوے کے لئے اس کے آڑے وقت پر کام آنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ حالانکہ جنرل لطافت کو فوج دے کر بھیجنا مستثنیات میں سے نہیں ہے لیکن میری رائے میں دہلی کی چہار دیواری میں ایسی فوج کی بے سود پریڈ جو محض اندرون دہلی مدد دے سکتی ہو اس کے قیام کے مقابلہ میں بدترین مظاہرہ ہے بلکہ یہ اعانت کے بجائے اہانت معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں یہ بادشاہ کی کمزوری کا قدرتی نتیجہ ہے اور یہ کمزوری اس کی سیاسی طاقت ہی تک محدود نہیں بلکہ اس کی اعلیٰ صلاحیتیں اور جوش و جذبہ تک مضمحل ہو چکا ہے اس کی بے عملی کی زندگی نے جو الہ آباد میں اور یہاں آنے کے بعد بسر ہوئی اس کی شخصیت کو بالکل تباہ و برباد کر دیا

ہے۔اسے ہر عمل اور ہر عزم و فیصلہ کے لئے ناکارہ بنا دیا ہے۔تمام معاملات میں اس کا اعتماد کلی وزیر عبداللہ خاں پر ہے جس کی قابلیت بحیثیت ماہرِ مالیات بلاشبہ مسلم ہے لیکن وہ کسی طرح بھی موجودہ مسائل سے عہدہ برآ ہونے کا اہل نہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ وہ پوری سلطنت واپس لیتا بلکہ وہ سلطنت کے باقی ماندہ ٹکڑوں کو بھی اپنے قبضہ وتصرف میں نہیں رکھ سکتا۔

نجف خاں

بنیادی طور پر نجف خاں ہر بات کے لئے بادشاہ کا ممنون احسان ہے بادشاہ ہی کی امداد واعانت سے اس نے ترقی کے مدارج طے کئے اور جاٹوں کی طاقت کو دبایا۔مگر یہ اس کی خوشی پر ہے کہ وہ بادشاہ کی تباہیوں کو جو اکثر ضابطہ خاں کی حالیہ بغاوتوں اور شاہی دستوں کے شکست کے سبب ہوتی ہیں آنے سے روک دے یا اس کا ازالہ کر دے۔اسے اپنے آقا کی تباہی کا صرف اتنا خیال ہے کہ وہ اس کی مدد کے لئے کسی شخص کو بھیج دیتا ہے یا درمیان میں پڑ کر مصالحت کی کوشش کر دیتا ہے اس کے برعکس قیاس یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ آگ پر تیل کا کام کر رہا ہے نیز کسی نہ کسی بہانہ سے بادشاہ کے مقبوضات پر دست تصرف دراز کرتا رہتا ہے کچھ حصے کلی طور پر اس کے علاقوں سے گھرے ہوئے ہیں وہاں کے زمینداروں کو ان کی بغاوتوں کے دوران اس کا تحفظ حاصل ہوتا ہے ان کے محصولات وہ خود ہی وصول کرتا ہے تاہم یہ باتیں ظاہر داری کو برقرار رکھتے ہوئے کی جاتی ہیں اطاعت کیشی اور نمک حلالی محض نامہ و پیام تک محدود ہو کر رہ گئی ہے اگرچہ یہ دیکھنا زیادہ دشوار نہیں کہ یہ معمولی سا پردہ بھی ایک کچے دھاگے کے سہارے رکا ہوا ہے۔بادشاہ کے اختیارات اور اس کی شان وشکوہ کا جائزہ لینے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی حقیقت ایک تصور محض یا عکس موہوم ہو کر رہ گئی ہے سکھوں میں تو یہ بات غیر معمولی حد تک نہیں البتہ نجف خاں کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک انسان کی خواہشات اسے خدا معلوم کس حد تک لے جائیں گی اس سے میرے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہندوستان میں جذبہء ممنونیت اور احسان مندی ناپید ہے۔

> نجف خاں انگریزوں سے ڈرتا ہے لیکن فی الحال وہ بہت دور ہیں اگر قریب ہوتے تو اس کا طرزِ عمل اس سے بہت مختلف ہوتا یا وہ اس سے مناسب لب ولہجہ میں گفتگو کرتے اس صورت میں مجھے یقین ہے کہ وہ

سنجیدگی سے غور کرتا۔ اس وقت وہ احتجاجی خطوط اور سومبر کو برطرف کرنے اور اس کے تحفظ کے ارادہ کا اظہار کر کے کونسل کو خوش فہمی میں مبتلا کر رہا ہے۔ اگر وہ خلوص رکھتا ہے تو واقعی میں بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔ لیکن اب تک اس سے التجائیں کی گئی ہیں اور جب تک کونسل اس طرح سے مخاطب کرتی رہے گی۔ نجف خاں اپنے دل میں کونسل کا مذاق اڑاتا رہے گا اور سومبر کو ملازمت میں رکھے گا۔ ان کو سنجیدہ ہو جانے دیجئے اور بریگیڈ کو گنگا عبور کرنے دیجئے پھر دیکھئے کہ نجف خاں اتنا ہی خاکسار اور فرماں بردار نظر آئے گا جتنا وہ اب متکبر اور گستاخ ہے۔ ہندوستانیوں کے ساتھ یہی طرزِ عمل مناسب ہے۔

میں نے اس موضوع کو اس لئے طول دیا ہے تا کہ آپ یہ اندازہ لگا سکیں کہ نجف خاں پر یا کسی اور امیر پر جو براہ راست کمپنی کے زیر سایہ نہ ہو کتنا اعتماد کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ سب یکساں ذہنیت رکھتے ہیں۔

آپ کا خیال تھا کہ بحیثیت سپاہی نجف خاں میں شرافت کا کچھ مادہ ہے لیکن اگر آپ اسے اس نقاب کے بغیر دیکھ لیں جو یہ امراء اپنے آقا یان فرنگ کے سامنے اپنے چہروں پر ڈالے رہتے ہیں اور خصوصاً اس وقت جب وہ یہ محسوس کرتے ہوں کہ وہ براہ راست ان کی گرفت میں ہیں تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ وہ آخر تک معمولی رکھ رکھاؤ کو بھی کام میں نہیں لائے گا اور اس میں شرافت کا شائبہ بھی محسوس نہیں ہو گا۔ تاہم میں اس سے انکار نہیں کروں گا کہ اس میں بعض خوبیاں بھی ہیں اور ان میں وہ یکہ و تنہا ہے۔ اس وقت اس کی جو شخصیت ہے وہ ان ہی صفات کی مرہونِ منت ہے۔ بے مثل استقلال کا مالک ہے۔ اپنے لائحہ عمل اور مشکلات کے دوران اس کا صبر و تحمل قابل داد ہے اس کے ارذل گروہ کی بدتمیزیاں اور گستاخیاں بھی کچھ کم قابلِ تعریف نہیں۔ اس کے پیروؤں میں ان ہی باتوں سے جوش و جذبہ باقی رہتا ہے۔ وہ انہیں وعدوں کی

دل کشی، اُمیدوں کی دل فریبی اور الفاظ کی خوش آہنگی سے بہلاتا رہتا ہے۔ انہیں اس کی موجودگی میں اس کے کردار پر نکتہ چینی کا حق حاصل ہے۔ وہ یہ مشورہ دے سکتے ہیں کہ اسے کیا کرنا چاہئے اور یہ حق اس کے ملازمین میں ادنیٰ ترین مغل کو بھی حاصل ہے اس کے ساتھ ان کا برتاؤ برابر والوں جیسا ہے افسروں جیسا نہیں یہ سب کچھ وہ نہایت تحمل بلکہ بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے اسی وجہ سے وہ اپنے آدمیوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر چہ یہ بات ماننی پڑے گی کہ وہ اس کی خدمت کی بجا آوری برے طریقہ سے کرتے ہیں۔ جہاں تک اس کی کذب بیانی کا تعلق ہے۔ یہ ہندوستانی کی سرشت میں داخل ہے۔ لیکن اس کے متعلق مجھے یہ کہنا چاہئے کہ ضرورت نے اسے اس امر پر مجبور کیا۔ کیونکہ اس میں خلق و مروت کا مادہ بہت زیادہ ہے یا پھر آپ اسے جو کچھ بھی کہیں۔ کسی کے سامنے صاف انکار کر دینا اور کسی کا اس کے سامنے سے غیر مطمئن جانا اس کی شائستگی اور خوش خلقی کے منافی ہے، یہی اسے جھوٹا بناتی ہے اور ایسے وعدوں پر مجبور کرتی ہے جن کے ایفاء کا وہ ارادہ نہیں رکھتا لیکن اس طرح بہت کم لوگ اس کے یہاں سے دل برداشتہ ہوکر جاتے ہیں اس کے یہاں ایک رسالدار تھا جس سے اس نے اکثر جھوٹے وعدے کئے تھے ایک دن وہ اس کے دربار میں حاضر ہوا۔ نجف خاں نے اس سے دریافت کیا کہ کیا خبر لائے ہو؟ اس نے جواب دیا کوئی خاص خبر نہیں۔ ایک تاجر چار گاڑی جھوٹ مرزا خاں کے لئے ابھی ابھی لے کر پہنچا ہے۔ اس نے بڑے پُر مذاق انداز میں کہا۔ ''بس اتنی سی بات یہ تو صرف ایک دن کے خرچہ کی ہیں۔'' اس کی یہ خوش طبعی اس کے مقاصد میں معاون ہوتی ہے۔ اگر وہ کم دستے رکھتا، اچھی تنخواہیں دیتا اور اپنی عزت بناتا تو اس میں شک نہیں کہ وہ بہت کچھ کر گذرتا اور جلد ہی طاقت ور ہو جاتا۔ اس کی موجودہ فوج کا ہر فرد اپنا حکم چلاتا ہے اور کوئی

بھی حکم کی تعمیل نہیں کرتا۔ جتنا روپیہ خرچ کرنے کی اس کی مقدرت ہے اس سے زیادہ فوج رکھنے کے سبب سے اس کی حیثیت ہمیشہ ایک کنگال رئیس کی سی رہتی ہے۔

سکھ

جہاں تک سکھوں کا تعلق ہے، میں نہایت وثوق و اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ اشرافی جمہوریت قطعی غیر محفوظ ___ ریاست ہے اور فی الحقیقت ایک مارصد سر کی حیثیت رکھتی ہے۔

دریائے اٹک سے ہانسی، حصار اور دہلی کے دروازوں تک ہر زمیندار جس کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی ہے واہ گرو کا نعرہ لگاتا رہتا ہے، سؤر کا گوشت کھاتا ہے، لوہے کا کڑا پہنتا ہے، بھنگ پیتا ہے، تمباکو نوشی سے نفرت کرتا ہے۔ دس سواروں کی کمان سنبھالتا ہے اور فوراً ایک سکھ سردار کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ جہاں تک اس کی طاقت میں ہوتا ہے وہ اپنے ہمسایوں کو دبا کر خود کو بلند کرتا ہے۔ خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان اگر یہ نہیں تو وہ اپنے ہی بھائیوں میں اپنی طاقت کی توسیع کی فکر کرتا ہے ان کے اندرونی علاقوں کو دیکھ کر یہ فرق ہر جگہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ اردگرد کچھ بھی ہوتا رہے ان کے یہاں کاشتکار اور مزدور بالکل محفوظ اور مطمئن ہیں۔

اس مختصر سے جائزہ سے یہ بہ آسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے ناقابل تسخیر نہیں ہیں جتنا کہ بتائے جاتے ہیں یہ صحیح ہے کہ جب کوئی حملہ کرتا ہے تو وہ متحد ہو جاتے ہیں جیسا کہ ابدالی کے ان کے علاقہ سے گذرتے وقت ہوا لیکن اس کے باوصف کہ انہوں نے کافی فوج جمع کر لی ہے وہ اچھے شہسوار بھی ہیں پھر بھی وہ درانی فوج پر ایک حملہ کرنے کی بھی جرأت نہ کر سکے اور نہ اپنی فوجیں بھیج سکے، ان کے یہاں بے قاعدگی اور احکام کی بجا آوری میں کوتاہی کو دیکھتے ہوئے میرے خیال میں ان کے لئے بہتر ہی ہوا کہ انہوں نے محصور ہو کر جنگ کی اور، منتشر سپاہیوں کا صفایا کر کے اور رسد کے راستے روک کر دل کو مطمئن کر لیا۔ وہ ان کاموں میں واقعی فوقیت رکھتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ وہ سرگرم عمل رہتے ہیں۔ ہندوستان کے بہترین گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں۔ لمبی نال کی توڑے دار بندوق رکھتے ہیں جس کو چلانے میں وہ کافی ماہر ہیں اور دشمن کو خاصہ پریشان کر دیتے ہیں زیادہ

تعداد میں کہیں جانا پسند نہیں کرتے اور نہ دشمن کے بہت قریب جاتے ہیں یہی ان کا انداز جنگ ہے۔ ان علاقوں کی حقیر ہندوستانی فوج کے لئے وہ خطرناک ہو سکتے ہیں جو سکھوں کے نام سے اس طرح ڈرتی ہے جس طرح بہت زیادہ عرصہ نہیں گذرا وہ مرہٹوں سے خوف کھاتی تھی وہ سکھ سردار جن کے علاقے شاہی مقبوضات کی سرحدوں پر واقع ہیں کچھ ہی عرصہ قبل جاٹ زمیندار تھے اور ان ہی کی ذات پات سے تعلق رکھتے تھے اگر وہ اسی فرقہ و مذہب سے وابستہ رہتے تو وہ قابل اعتنا نہ ہوتے لیکن اب جب سے انہوں نے لوہے کے کڑے پہننا شروع کئے ہیں اس وقت سے کیفیت یہ ہوگئی ہے کہ ان کی صرف پچاس کی تعداد شاہی فوج کی پوری بٹالین کا مقابلہ کر سکتی ہے اس سے ان کے مذہبی جوش و جذبہ اور ان کی سپاہیانہ شہرت کی قدر و قیمت کا پتہ چلتا ہے یہ ہیں بادشاہ کے قریبی ہمسائے۔

[نجف خاں کے پانچ سو سوار، سکھوں کے پچاس سواروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے لیکن اس کے باوجود بھی وہ اتنی حقیر اور قابل نفرت مخلوق نظر آئے گی جتنی حقیر سے حقیر متصور ہو سکتی ہے سومبر کے گروہ اور لطافت کی فوج کے لئے یہ نہیں کہا جا سکتا لیکن نجف خاں آدھ گھنٹہ بھی ان کے مقابل نہیں ٹھہر سکتا۔ غرض کہ یہ ہے اس طاقت ور سردار کی کیفیت!]

نجف خاں کی مالی حالت

آٹھ ماہ قبل جاگیروں کے علاوہ اس کے پاس اتنا بڑا علاقہ تھا، جس کے محصولات سے اسے سالانہ پچاس لاکھ روپے وصول ہوتے تھے۔ لیکن اب ضابطہ خاں کے مقابلہ پر اس کی افواج کی شکست کے بعد بہت کم علاقہ اس کے قبضہ میں رہ گیا ہے اور اب واقعی یہ اندازہ لگانا دشوار ہے کہا سے کیا یافت ہوتی ہے کیونکہ ان مقامات پر محصولات جمع کرنا اس قدر خطرناک ہے کہ بغیر فوجی طاقت کے ممکن نہیں۔

آمدنی اس قدر غیر یقینی اور معمولی اور انتظام اس قدر خراب ہے کہ اگر اس کی فوجیں خراب و خستہ حالت میں ہوں تو کوئی تعجب نہیں۔ چند فوجیں جو اس کے پاس رہ گئی ہیں اس حالت میں ہیں کہ اس سے بدتر ممکن نہیں۔ تنظیم، نظم و نسق اور اطاعت گذاری کی عادت پیدا کئے بغیر ان سے کسی

قسم کی خدمت نہیں لی جاسکتی۔ان کے لئے یہ بھی بہت دشوار کام ہے کہ وہ ان علاقوں کی محصولات جمع کرلیں جوان کی تنخواہوں کی ادائیگی کے سلسلہ میں انہیں تفویض کئے گئے ہیں۔

شاہی افواج

دودست و پا بریدہ بٹالینیں اور چند جاں بلب کمپنیاں شاہ عالم کی حفاظت کے لئے باقی رہ گئی ہیں۔ یہ یقینی ہے کہ یہ سب ہماری شاہی پیادہ فوج کی ابتدائی دو کمپنیوں کے برابر بھی نہیں ہیں۔ وہ دو بٹالینیں جو بادشاہ کی الہ آباد سے روانگی کے وقت اسے دی گئی تھیں انہیں علیحدہ کر دیا گیا ہے اور کچھ عرصہ قبل دائیں جانب (؟) بھیج دیا گیا ہے ان کی بغاوت اور گستاخی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ ان کے لئے یہ اقدام قطعی لازمی ہو گیا تھا کیوں کہ ایسی فوجوں سے کسی خدمت کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ میرے خیال میں یہی احتیاط کا تقاضا تھا اور یہی مناسب تھا حالانکہ مجھے اس امر کا بھی کافی حد تک یقین ہے کہ ان کی برطرفی میں کچھ اور محرکات بھی کارفرما تھے۔

دونوں کماندار اپنے مفادات کی قطعی یکسانیت کا اندازہ لگا کر وزیر کے اقتدار سے آزادانہ روش اختیار کر بیٹھے تھے وزیر اس قسم کی سرتابی پر جھنجھلا کر رہ جانے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا لیکن بجائے اس کے کہ وہ صفائی قلب سے کام کرنے کا ارادہ کرتا اور وقت پر اپنی طاقت صرف کر کے انہیں از سر نو مطیع بناتا۔ اس نے صوبیداروں میں گروہ بندی کا کام کیا، اور انہیں ان کے کمانداروں کے خلاف اور کمانداروں کو ایک دوسرے کے خلاف مدد دی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ان کے تمام نظم ونسق کا خاتمہ ہو گیا حالانکہ اس سے وزیر کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا کمانداروں نے جن کی طرفداراب بھی سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد تھی____ انہیں نکال باہر کر دیا۔ اس سے وزیر عبداللہ کو فکر لاحق ہو گئی کہ کسی طرح ان سے نجات پا جائے جس پر آخر کار عملدرآمد کیا گیا۔ اس کے بعد ہی انہوں نے اس سے اپنے بقایا جات کا ایک ایک حبہ وصول کرلیا۔ مختصر یہ کہ افراتفری اور بدنظمی کا ایسا منظر جوان بٹالینوں نے پیش کیا کہیں بھی دیکھا نہیں جاسکتا، ایسی حالت میں بھی یہ احمق وزیر فتوحات حاصل کرنے اور ہمسایوں کو مطیع بنانے کا تصور کرتا رہا نتیجہ بالآخر وہی ہوا جو فطری طور پر متوقع تھا۔ بٹالینوں کو شکست فاش ہوئی اور یہ واقعہ دہلی کے لئے بہت خطرناک ثابت ہوا۔

قاسم علی خاں

قاسم علی خاں نے بہت سی مہموں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ فرار ہونے کے بعد آخر کار پلوں میں سکونت اختیار کر لی ہے جو یہاں سے بیس کوس کے فاصلہ پر آگرہ سے دہلی آنے والی سڑک پر واقع ہے وہاں وہ ایک شکستہ خیمہ میں جس کے دوطرف ٹوٹی پھوٹی دیواریں ہیں تقریباً اپنے پچاس ملازمین کے ساتھ نہایت عسرت کی زندگی گذار رہا ہے وہ ہمیشہ اپنی غربت ومصیبت کے اظہار کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ ڈاکوؤں کے چھوٹے یا بڑے گروہوں سے مامون ومحفوظ رہے، اسے جیسا کہ مجھے یقین ہے نجف خاں کی جانب سے پوشیدہ طور پر تھوڑی سی پنشن ملتی ہے (اسی پر اس کی گذر اوقات ہے۔ وقتاً فوقتاً اس کی (نجف خاں کی) خواہشات کو پورا کر کے کچھ مل جاتا ہے)۔

اس کے وقت کا کچھ حصہ اشیائے خوردونوش کو تیار کرنے میں جس کے لئے اسے کسی پر اعتماد نہیں ہے، اور خط وکتابت میں صرف ہوتا ہے باقی تمام وقت وہ علم نجوم پر غور وخوض کرتا رہتا ہے۔ اپنے تمام کام وہ ستاروں کو دیکھ کر کرتا ہے اسے پورا یقین ہے کہ ان کے مطابق وہ ایک دن بنگال یا دہلی کی مسند پر دس گنا طاقت اور شان وشوکت سے متمکن ہوگا۔

[میں اسے ان دل خوش کن امیدوں کے ساتھ چھوڑتا ہوں، یہ ناممکن نہیں ہے کہ کچھ عرصہ میں اس کے مال ودولت کے لوٹنے کی غرض سے کوئی اسے مار ڈالے۔ اس کا بھائی بوعلی خاں یہاں موجود ہے اور کسی کام سے زیادہ وہ میری اور دوسروں کی خفیہ نگرانی پر مامور ہے لیکن اس عرصہ میں میں نے اپنے آپ کو اتنا بے تعلق ظاہر کیا ہے کہ مجھے یقین ہے کہ وہ پہلے کی طرح مجھ پر شک وشبہ نہیں کرے گا۔ اب میں اس ہیرو کے تذکرہ کو یہاں ختم کرتا ہوں۔]

(بعد کو تحریر کیا گیا)

[قاسم علی خاں آخر کار فوت ہو چکا ہے اور دفن کیا جا چکا ہے۔ اس کی وفات (بروز جمعہ) 29- ربیع الثانی (1191ھ) مطابق 6- جون 1777ء کو

دہلی میں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ انتہائی غربت وافلاس میں مرا، کفن دفن کا انتظام اس کی شال فروخت کر کے کیا گیا۔ بادشاہ کے آدمیوں نے فوراً ہی اس کے جانور اور ساز وسامان کو لوٹ لیا اور اس کے اہل وعیال کو قید کر لیا، لیکن بعد کو نجف خاں کی مداخلت پر سب کچھ واپس کر دیا گیا۔ اس کے دو بچے نجف خاں کی حفاظت میں یہاں پہنچے ہیں۔ ایک دن میں ان کے پاس سے گذرا تھا دونوں کمسن ہیں ایک بارہ سال کا اور دوسرا دس سال یا کچھ کم عمر کا ہے ان کے پاس ایک چھوٹا خیمہ ہے جس کے ایک طرف کا حصہ بہت زیادہ بوسیدہ ہے ایک پالکی سواری کے لئے ہے جو کبھی طلائی کام سے مرصع ہو گی۔ ان کا لباس بہتر ہے۔ بلکہ شاندار ہے میرا خیال ہے کہ نجف خاں ان کی اتالیقی اور سرپرستی کے بہانہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ ان کے پاس کوئی شے پوشیدہ ہے یا نہیں اور اگر ان کے پاس کچھ ہے تو وہ اسے خود حاصل کر لے گا۔ قاسم کے مال و دولت کے متعلق مختلف قسم کی اطلاعات اور قیاسات ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ اس نے کچھ نہیں چھوڑا بلکہ اس کے پاس خورد ونوش کے لئے بھی کچھ نہیں تھا۔ بعض یہ یقین دلاتے ہیں کہ اس کے پاس اس حالت میں بھی قیمتی جواہرات اور خاصی رقوم کی دستاویزات تھیں۔ ان متضاد بیانات کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ معاملہ کی نوعیت ان کے بین بین ہے پھر بھی میں اتنا جانتا ہوں کہ اس کے پاس کافی رقم کی دستاویزات تھیں اگر چہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ جعلی تھیں یا صحیح یہ مجھے ایک عینی شاہد کے ذریعہ معلوم ہوا ہے۔ اس کے بچوں کے پاس سے گذرا تو مجھے وہ واقعہ یاد آ گیا جب ایک دفعہ پٹنہ میں مجھے اپنے گھوڑے سے اتر کر اس وقت تک کھڑا رہنا پڑا تھا جب تک اس کے خدم وحشم میرے قریب سے نہیں گذر گئے تھے اس کے بعد مجھے گھوڑے پر سوار ہونے، اور رخصت ہونے کی اجازت ملی تھی۔

یہی طرزِ عمل میں اس کے بچوں کے لئے بھی اختیار کر سکتا تھا لیکن میرے دل میں کوئی عناد نہیں ہے علاوہ ازیں اس نے خود بھی اس وقت کے طرزِ عمل کو محسوس نہیں کیا ہوگا۔]

(ہل ایشیاٹک اینول رجسٹر 1800ء کا حوالہ دیتا ہے جس میں پولیر کا ایک طویل اقتباس ''بادشاہ، اس کے علاقہ جات اور نجف خاں'' کے حالات کے تحت درج ہے۔ اس سے پتہ چل جائے گا کہ اگرچہ بعض اجزاء مشترک ہیں تاہم انڈیا آفس کے مسودہ میں نیا مواد شامل ہے، لیکن ایشیاٹک اینول رجسٹر میں شائع شدہ کئی سطریں چھوڑ دی گئی ہیں، جو پیراگراف ایشیاٹک اینول رجسٹر میں نہیں ملتے۔ ان پرستاروں کے نشانات ہیں اور وہ اجزاء جن کو انڈیا آفس کے مسودہ میں چھوڑ دیا گیا ہے قوسین میں درج ہیں)

(3)

صوبہءاودھ کے حالات

(یکم اپریل تا آخر جون 1776ء)

اودھ کا دیوان

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نواب اودھ کا دیوان مختار الدولہ مالی امور اور انتظام مملکت میں کامل دستگاہ رکھتا تھا لیکن اس نے اپنی ذاتی اغراض کی خاطر نواب کو معاملات حکومت سے بے خبر رکھنے کی کوشش کی اس نے اپنے چیلوں چاٹوں کو محصولات کی وصولیابی کے لئے مقرر کیا اور اپنے ہی ہواخواہوں کو تمام اعزازی اور سرکاری عہدوں پر فائز کر دیا ان طریقوں سے اور ہر شعبہ میں ادائیگی کے تمام معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس نے نواب کو اس حد تک اپنا دست نگر بنالیا کہ وہ شاید ہی کبھی دس ہزار روپئے اپنے قبضہء واختیار میں رکھ سکا ہو۔ دربار کے بعض بہی خواہوں نے اس بے بسی کا احساس دلا کر آخر کار نواب کی آنکھیں کھول دیں اسے اپنا وقار خطرہ میں نظر آنے لگا اور شاید وہ خوف محسوس کرنے لگا، اس نے وزیر کے اس طرزِ عمل پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار شروع کر دیا اور اکثر و بیشتر اس کو متنبہ کیا۔ لیکن اکثر اوقات اس کو ٹھنڈا اور مطمئن بھی کر دیا گیا اس میں کبھی کسی وزیر کی اطاعت وفرماں برداری سبب بنی اور کبھی انگریز ایجنٹ کی مداخلت محرک ہوئی۔ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اس کا بہی خواہ تھا۔

خواجہ سرا۔ بسنت

اس وقت نواب کے کیمپ میں ایک خواجہ سرا بسنت نام کا تھا۔ جو ایک ذکی الطبع نوجوان اور فطری طور پر خوش طبع انسان تھا اور جس کی خوش طبعی یورپی لوگوں سے ایک عرصہ کے آزادانہ اختلاط اور میل جول کے سبب پختہ ہو کر علم و دانش، بلند حوصلگی اور نکتہ رسی کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اپنی زندہ دلی اور ذہانت کی وجہ سے وہ شجاع الدولہ اور انگریز افسروں کو بہت زیادہ محبوب تھا۔ اپنے قدیم آقا (شجاع الدولہ) کی وفات پر مختار الدولہ سے اَن بن کی وجہ سے وہ اس کے بیٹے کی نظر التفات سے محروم ہو گیا تھا اور دربار سے اس کا سابقہ اثر و رسوخ بھی ختم ہو چکا تھا۔ اسے تمام پیادہ فوج کے کمانڈر انچیف کے عہدہ سے ہٹا کر صرف چھ بٹالینوں کی کمان دیدی گئی تھی تاہم اب اسے نواب کی نگاہ لطف و کرم حاصل ہونی شروع ہو گئی ہے۔ اس نے اور دیوان نے باہمی رنجشوں کو ختم کر دیا ہے اور دونوں نے قرآن کو درمیان میں رکھ کر لافانی اتحاد کی قسم کھائی ہے۔

''اگر وہ قسم کھاتا ہے تو یقیناً تجھے دھوکا دے گا۔''

دیوان اودھ مختار الدولہ کا قتل

اس صلح کی تکمیل کے لئے بسنت نے اس کی دعوت کا انتظام کیا اور دیوان کو اس میں مدعو کیا۔ دیوان شریک ہوا۔ کئی گھنٹے تک یہ لوگ مے نوشی کرتے رہے، اور عورتوں کے رقص سے لطف اندوز ہوتے رہے اور مختار الدولہ بدمست ہو کر بستر پر دراز ہو گیا۔ جیسے ہی وہ سویا دو قاتل کمرے میں داخل ہوئے اور انہوں نے خنجروں سے اس کا کام تمام کر دیا۔ بسنت نے فوراً ہی اپنی ایک بٹالین کو مسلح ہونے اور توپیں نکالنے کا حکم دیا۔ اس دوران میں وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور قدر افزائی کے لئے نواب کے پاس گیا۔ شمشیر برہنہ لئے ہوئے نواب کے حضور میں پہنچا اور اس واقعہ کی اطلاع دی نواب اس سے کافی خوف زدہ ہوا، اور اس فعل پر لعنت و ملامت کرنے لگا، اس نے دریافت کیا___ کیا وہ اسے بھی مارنے آیا ہے۔ بسنت نے کیا جواب دیا، اس کا صحیح طور پر علم نہیں، لیکن کہتے ہیں کہ اس نے نواب کو اس معاملہ میں شریک بتایا اور کہا کہ اسی نے تو اس کام کے انجام دینے کا حکم دیا تھا، کچھ کہتے ہیں کہ وہ محض متوحش اور متفکر نگاہوں سے اِدھر اُدھر خلاؤں میں

گھورتا رہا، گویا کسی شے کو تلاش کر رہا ہے اور پھر اس نے نا اُمید ہو کر خاموشی سے تلوار اس کے حوالہ کر دی اس وقت نواب کے _____ پاس جو ملازمین تھے ان کے اشارہ پر نواب نے فوراً کہا کہ وہ محفوظ و مامون ہے، دروازے بند کر دیئے گئے اور اسی جگہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے۔ اس کا ایک عزیز اسے بچانے کے سلسلے میں زخمی ہو گیا مگر بے سود _____ بہت سے حملہ آوروں نے اسی وقت اسے ختم کر دیا، جب یہ غیر معمولی واقعات اندرون کمرہ رونما ہو رہے تھے، نواب کا چھوٹا بھائی سعادت علی نیچہ اور پستول سے مسلح ہو کر خیمہ کی طرف آیا اور اس نے اندر داخل ہونا چاہا لیکن داخلہ کی اجازت نہیں ملی یہ سن کر اس نے فوراً گھوڑا لیا اور آگرہ کی جانب فرار ہو گیا۔

قتل کے محرکات

آیا نواب کے حکم یا اس کے اغماض سے خواجہ سرا نے مختار الدولہ کی جان لی اور بعد کو اسے بھی اس لئے ختم کر دیا گیا۔ تاکہ وہ اس واقعہ کے متعلق صحیح ہدایات بیان نہ کر دے یا اس نے ذاتی رنجش کی بنا پر اس سے نجی طور پر انتقام لیا، یا ایسا ہو کہ نواب کے حکم کے بعد بسنت نے سعادت علی سے مل کر پلات تیار کیا ہو تاکہ اسے مسند حکومت پر بٹھا جائے بہر حال یہ معاملہ اب بھی مشتبہ ہے۔ اس حد تک یہ امر یقینی ہے کہ سعادت علی خفیہ طور پر، بسنت، نجف خاں اور بھائی کی افواج سے خط و کتابت کر رہا تھا یہ بھی مصدقہ امر ہے کہ اس دن اس کے پاس بہترین گھوڑے تیار تھے جو مہا گوسائیں سے مستعار لئے گئے تھے ہر سڑک پر (علاوہ اس سڑک کے جس پر وہ جانے والا تھا) ہرکارے متعین تھے تاکہ وہ پیچھا کرنے والوں کو یہ فریب دے سکیں کہ وہ اسی سڑک پر گیا ہے یہ بھی اعتماد کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ نواب نے بسنت سے اس دعوت میں شرکت کا وعدہ کیا تھا لیکن نواب نے اپنا ارادہ بدل دیا اور شریک نہیں ہوا۔

فوج میں سرکشی اور شورش کی وجہ

ان جتھہ بندیوں اور گٹھ جوڑ کی وجہ سے _____ نواب کے سپاہیوں نے حالیہ بغاوت اور سرکشی کی ہے، اپنے مفادات کی کمی کے پیش نظر مختار الدولہ کے لئے یہ فطری امر تھا کہ وہ انگریز

افسروں کو متعارف کرائے انگریز ایجنٹ کے لئے وزیر کی تحریک اس کی خواہش کے مطابق تھی، لیکن اپنی حکومت کی بہبودی یا اپنے وقار کا پاس یا اس کے نتائج بہرحال ان میں سے ہر ایک نواب کے اس اقدام سے روکنے کی معقول وجہ ہوسکتی تھی اگر اس نے پسِ پردہ جیسا کہ قیاس کیا جاتا ہے اپنے سپاہیوں کو انگریز افسروں سے لاپروائی پر آمادہ کیا (اگرچہ وہ منتشر کر دیئے گئے تھے لیکن پھر بھی خط و کتابت جاری رکھے ہوئے تھے) تو یہ ایک ایسی صورتِ حال تھی جس پر تعجب کے بجائے افسوس ہونا چاہئے ایک تجربہ کار افسر نے جوان باغیوں سے بچ کر نکل آیا تھا مجھے بتایا کہ اس نے افواج کے باغیانہ جذبات اور ناموزوں کیفیات کی اطلاع اس ہنگامہ خیزی سے قبل دیدی تھی۔ میری اور دوسرے کئی افسروں کی ان شکایات کے باوجود کہ اتنی بٹالینوں کو ایسے مقام اٹاوہ پر جمع کر رکھا ہے جہاں انہیں ایک دوسرے سے سازش کرنے کا موقع باآسانی دستیاب ہے مزید برآں ان کی تنخواہیں بھی (بقایا) میں ڈال رکھی ہیں، مگر ان کو پھر بھی وہیں رکھا گیا، ان کے واجبات ادا نہیں کئے گئے اور پھر اس تمام عرصہ میں انہیں سازباز کا موقع دیا گیا جس کی وجہ سے یہ شورش رونما ہوئی۔

میں اس وقت اس شورش اور افواج کی در پردہ سازشوں کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا کیونکہ تفصیلات منسلکہ ڈائری میں منضبط کر دی گئی ہیں لیکن اس سے پیدا ہونے والے فطری نتائج پر اپنے خیالات کا اظہار کروں گا۔

انگریز افسر اور ان کی مشکلات

اگر میرا خیال درست ہے تو ہمارے نمائندوں نے نواب اودھ کے بارے میں ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ وہ سوار فوج کی تو خود تربیت کرتا ہے، اور پیدل فوج کے لئے انگریزوں کا سہارا لیتا ہے، یہ ایک سیاسی اور میرے نزدیک زیادہ مناسب یہ ہے کہ ایک دانش مندانہ منصوبہ ہے۔

محمد علی کی ملازمت سے تمام افسروں کی برطرفی اس منصوبہ کی توثیق و تصدیق کرتی ہے لیکن اس معاملہ میں ان کے نظریات سے قطع نظر جو بنگال کے متعلق ان کے نظریات سے قطعی مختلف ہیں پانچ یا چھ غیر ملکی افسروں کے لئے (جن میں سے نصف یہاں کی زبان سے ناواقف اور جنگی امور میں ناتجربہ کار ہیں) یہ کس طرح ممکن ہے کہ ان دو ہزار سپاہیوں کی تنظیم اور نگرانی کریں جو ایک

ایسے غیر ملکی شہزادہ سے وابستہ ہوں جوان کی قوم سے زیادہ مانوس ومتاثر نہ ہو بلکہ ان کی خدمات سے بیزار ہو 700 سپاہیوں پر 20 یورپی افسروں، تعزیری قوانین جو ہر وقت لاگو ہوں سخت تادیبی اور اقتصادی نظام اور تنخواہوں میں باقاعدگی کے باوجود بھی ہم اپنی بٹالینوں میں مناسب نظم وضبط قائم رکھنا دشوار سمجھتے ہیں ہم نے اس مقصد کے لئے یہ اشد ضروری پایا ہے کہ سپاہیوں کے کپتانوں کو بہت سے حقوق واختیارات دیئے جائیں تاکہ وہ اپنے اقتدار میں اضافہ کرسکیں اگر انہیں اس قسم کی مراعات اور ہمت افزائیوں سے محروم رکھا گیا تو سپاہیوں میں اطاعت وتعمیل حکم کا جذبہ اور بہتر نظم ونسق متوقع نہیں، ابتداء میں نواب کی افواج کی جانب سے انگریز افسروں کے لئے تعظیم وتکریم کی صرف ایک مناسب تدبیر تھی اور وہ یہ کہ پرانی بٹالینوں کو بالکل توڑ دیا جائے اور منتشر کر کے از سر نو ترتیب دی جائے۔

اس طرح کپتان اپنے اپنے رسالے کے خود منتظم ہوں گے ہمیں تمام افسروں کا تقرر جن کے منصب میں اضافہ صرف ان ہی کی بدولت ہوا ہوگا انہیں اپنی تجاویز کے مطابق کام شروع کرنے کا فائدہ جس سے جدّت کا شائبہ بھی دور ہو جائے گا اور انعامات کا لالچ اور سزا کا خوف دلا کر اطاعت وتعظیم کا جذبہ پیدا کرنا وغیرہ سب شامل ہیں۔ اگرچہ نواب غیر ملکیوں کو یہ مراعات دینے کو تیار ہے (وہ امتیازی حقوق جن کو دینے میں ہمارے بادشاہ کافی سخت ہیں) تاہم انگریز افسروں کی تعداد اتنی کم ہے کہ نواب کی تمام مراعات بے سود ہیں۔ علاوہ ازیں تنخواہوں کا سنگین اور غیر یقینی معاملہ ایسی رکاوٹ ہے جس پر کبھی قابو نہیں پایا جاسکتا۔ عہدوں میں امتیاز وترجیح میرے لحاظ سے اس سلسلہ میں ایک انتہائی اہم نکتہ ہے مگر اس کے بجائے عام طور پر نوجوان افسروں کی نامزدگی محض جانبداری اور ذاتی پسندیدگی اور خصوصاً برطانیہ سے آئی ہوئی سفارشات کے تحت ہوتی ہے لیکن میں اس پر زیادہ زور دینا نہیں چاہتا۔

اس وقت نواب کی بٹالینوں کی اصل تعداد وطاقت قطعی نامعلوم ہے کماندار افسروں کو دھوکہ دینے کا ہر طریقہ استعمال کرتے ہیں اور اپنے متصدیوں کو جن کے پاس حسابات اور ان کے حاضری کے رجسٹر ہوتے ہیں۔ جدا نہیں کرتے۔ اس طرح وہ اصل سے چار گنا زیادہ کی تنخواہیں وصول کرتے ہیں، اس قسم کی حرکات سے کیا نتائج پیدا ہوسکتے ہیں یہ اخذ کرنا بے سود ہے۔

انگریز افسروں کو رکھنے سے ان صوبوں کو کیا فائدہ یا نقصان ہوسکتا ہے یہ بعد کو منصۂ شہود پر

آئے گا لیکن مجھے یہ نظر آتا ہے کہ اگر ایک مسلمان فوجدار اور دو یا تین عیسائی ایک ہی ضلع میں وصولیابی کا کام کریں تو محاصل میں کوئی خاص اضافہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اگر وہ زیادہ ذہین ہوں گے تو ایک دوسرے کے مقاصد ہی کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہیں گے اور اگر بیوقوف ہوں گے تو لڑیں گے۔

اس ملک میں کوئی ایسا اصول وضابطہ موجود نہیں ہے جو یہاں کے لوگوں کو فرائض کی ادائیگی کے لئے صحیح طور پر آمادہ کر سکے۔ مجھے اپنے تجربات سے معلوم ہے کہ لوگوں کی دربار تک رسائی اور انہیں نواب کے کان بھرنے سے روکنا قطعاً ناقابلِ عمل ہے اور لوگوں کو ایسے ماحول میں جہاں خبروں میں افراط وتفریط اور خبر رسانی میں آزادی ہو فطری طور پر اعتماد کر لینے سے روکنا تقریباً ناممکن ہے آپ اس کے متعلق یہ فرمائیں گے کہ گمراہ کن اطلاعات پہنچنے سے قبل ہی تیزی سے نواب کو باخبر کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ میں صرف ان ہی باتوں سے نتائج سے اخذ کر سکتا ہوں جو میری نگاہوں کے سامنے ہیں (اس قسم کے فلسفی بھی ہوتے ہیں جو مادہ کی نفی یا لاشیئیت کے فلسفہ کی تائید و توثیق کرتے ہیں) اس لئے میں بلا تامل یہ باور کئے لیتا ہوں کہ میں غلطی پر ہوں لیکن اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قادرِ مطلق نے یہاں ایک آمر اور چند پروقونصل مقرر کر دیئے ہیں جس میں سے اول الذکر کو میں بٹاویہ کے گورنر اور ثانی الذکر میں سے کسی کو بھی ادیب ہیر سے زیادہ پُر منفعت اور گرانقدر سمجھتا ہوں۔

(ہل کا کہنا ہے کہ وہ دستاویز اسی خط میں لکھی گئی ہے جس میں پہلی ہے اور ازروئے قیاس میجر پولیر کی ہے۔ مسودہ کے پہلے جز میں آصف الدولہ کے وزیر مختار الدولہ مرتضٰی خاں کے قتل کا ذکر ہے اور دوسرے جز میں نواب کی فوج کی حالت پر ایک نوٹ اور برطانوی افسران کے تقرر پر پسندیدگی کا اظہار ہے۔ مرتضٰی خان کے قتل کا مختصر حال اِرون کی کتاب گارڈن آف انڈیا (ہند کے باغ) میں بھی درج ہے۔ لیکن یہ دستاویز تفصیلی حالات پر مشتمل ہے اور اس تحریر میں بتایا گیا ہے کہ اس میں نواب کے برادرِ خورد سعادت علی نے کتنا حصہ لیا لیکن سعادت علی کے خلاف کوئی بلاواسطہ شہادت موجود نہیں تھی حکومت برطانیہ صاف طور پر اس کی بے گناہی

پر یقین رکھتی تھی۔لیکن اس کا فرار ہو جانا ایسا امر تھا جس کو شک کی نظر سے دیکھا گیا۔لارڈ ویلنشا جس نے 1809ء میں اودھ کا دورہ کیا تھا ان الفاظ کے اضافہ کی ضرورت محسوس کرتا تھا کہ سعادت علی کے خلاف کبھی کوئی ثبوت بہم نہیں پہنچایا گیا۔اس کے فرار کو اس روشنی میں جانچنا ٹھیک بھی نہیں ہے.....''اس کاغذ سے اس کی بے گناہی کے ثبوت میں مدد نہیں ملتی۔''اس کے برخلاف اس کے چال چلن پر کسی قدر شبہ کی نظر پڑتی ہے۔

قاری اس بات کا مشاہدہ کرے گا کہ غالباً پولیر کو اپنا دورِ حیات یاد تھا۔جب اس نے یہ الفاظ تحریر کئے کہ میں اس سے قطعاً مایوس ہوں کہ کبھی ترجیح کے لئے کسی امیدوار کی ذاتی قابلیت اور اس کی طویل مدت ملازمت کو معیار قرار دیا جانا دیکھ سکوں۔'' آخری جملوں کی بناوٹ ناقص ہے اور جگہ جگہ مفہوم مبہم ہے)

شاہ عالم ثانی

کے عہد کا

دوسرا عینی شاہد

لوئی۔لوران۔دُولیسی، کامتَ دَماداوَ

1774ءتا1776ء

شاہ عالم ثانی

(1774ء-1776ء)

موجودہ بادشاہ ایک اچھے اور دلکش کردار کا ایسا فرماں روا ہے جس میں نہ جوش و جذبہ کی کمی ہے نہ ذہانت کی۔ تخت نشین ہونے کے بعد ابتدائی سالوں میں اس نے ذاتی طور پر امورِ سلطنت کے انتظام و انصرام میں حصہ لیا بنابریں اس سے یہ اُمیدیں وابستہ ہوگئی تھیں کہ وہ اپنے آخری پیشروؤں کے مقابلہ میں بہتر ثابت ہوگا مگر اس کی کمزوری کہئے یا حالات کی ستم ظریفی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لاپروائی مستقلاً اس کا شعار بن گئی ہے اور وہ انتہائی ادنیٰ قسم کے حرص وطمع کا خوگر ہوگیا ہے جو اُس کے حالات کے تحت قابل معافی ہے۔ بشرطیکہ حدود سے متجاوز نہ ہو۔ تاہم ان لوگوں نے جو اس سے بہتر طور پر واقف ہیں۔ مجھے یقین دلایا ہے کہ اس کی یہ لاپروائی محض دکھاوے کی ہے اس کے پردے میں اس کے بڑے بڑے منصوبے ہیں جو ان کی معلومات کے مطابق منصۂ شہود پر آنے والے ہیں۔ اس کی شکل وصورت سے یہ یقین ہوتا ہے کہ اس میں جوش و جذبہ اور خیر پسندی موجود ہے۔ مجھے کئی مرتبہ اس سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، میں نے اکثر اس کے چہرے پر ایک ایسا کرب واضطراب دیکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ بلند تخیلات کا حامل ہے۔

نواب عبدالاحد خاں اس وقت بادشاہ کا معتمد وزیر تھا، وہ ضعیف العمر شخص اپنی سفید داڑھی، شائستہ اطوار، مذہبی اور دلآویز کردار کی بنا پر قابل احترام اور مقدس ہے، اس کا شریفانہ رویہ اس عیب کی پردہ پوشی کرتا ہے جو اس کی پوری بائیں آنکھ کے پھلی سے ڈھک جانے کی وجہ سے پیدا ہوگیا ہے اور جس نے اس کے چہرے کو بدنما بنادیا ہے اس نواب کو بادشاہ کا کلی اعتماد حاصل ہے اور

اس کا کوئی ہمسر نہیں وہ اس کے تمام رازوں سے واقف ہے بات کا پکّا ہے اور دوسرے ہندوستانی امراء کے مقابلہ میں جن کے سامنے ہمارے یورپ کے انتہائی ڈھیٹ قسم کے مکار و دغا باز بھی نوآموز نومشق ہیں، کم دروغ گو ہے۔

شاہ عالم نے اپنے باپ کی حیات میں کچھ آزادانہ روش اختیار کر لی تھی اور بادشاہ کی خدمت انجام دینے کا عذر کر کے نامعلوم طریقہ پر دربار سے روانہ ہو گیا تھا۔ وہ سلطنت کے مختلف صوبوں میں پھرتا رہا اور بردوان تک پہنچا، جو قاسم بازار کے جنوب مغرب میں بنگال کا ایک حصہ ہے.....

ان اسفار اور مہمات نے جو اسے اختیار کرنا پڑیں اس کے خیالات میں وسعت پیدا کی اور ان مواقع نے جن کے تحت وہ متواتر فرانسیسیوں اور انگریزوں سے ملتا رہا، امور سلطنت کے متعلق ایسی معلومات بہم پہنچائیں جو اس کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں ممد و معاون ثابت ہوئیں۔ لیکن دہلی واپس آنے کے بعد یہاں کے پیچیدہ حالات اور غالباً سہل انگاری کی دلکشیوں نے ___ اس کے تمام اوصاف کو کم از کم اس وقت بیکار محض بنا رکھا ہے۔ اپنے میر بخشی سے حسد اور اپنے ناقابلِ اعتبار وزیروں پر کم سے کم اعتماد کی وجہ سے اپنے وقت کو جیسا کہ کہا جاتا ہے جیسے تیسے کاٹ رہا ہے اسے ہر وقت یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں محل میں کوئی بغاوت نہ ہو جائے جس کی وجہ سے وہ پھر اس قید خانہ میں ڈال دیا جائے جہاں وہ پیدا ہوا تھا تاکہ اس کا کوئی اور جانشین بنا دیا جائے جو بلاشبہ اس سے کم تر ہوگا۔

یہ کیفیت ہے ان بدقسمت فرماں رواؤں کی جو اچھے کام کرنے کی ہمت نہیں رکھتے حالانکہ وہ انہیں اچھا سمجھتے ہیں اور انجام دہی کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔

اس مطلق العنان بادشاہ میں ایسی دو خصوصیات ہیں جو اس کے خانوادہ میں موروثی معلوم ہوتی ہیں یعنی غیر معمولی طور پر تصوف کی طرف مائل ہے اور صنف نازک سے شغف رکھتا ہے اور ان ہی زہرہ جبینوں کے درمیان زندگی گذارتا ہے اس کے حرم میں 500 کم عورتیں نہیں ان کے علاوہ اور بہت سی کنیزیں ہیں جو حرم کی خدمت پر مامور ہیں اور یہ کنیزیں بھی بعض اوقات بادشاہ کی نظر التفات کا مرکز بن جاتی ہیں فرصت کے اوقات میں جو بادشاہ کی عمر کا تقاضہ ہے قرآن کی تلاوت کرتا ہے اور تسبیح و تہلیل میں مشغول رہتا ہے ___ میں نے اسے فقیروں اور مُلّاؤں کے

درمیان بھی دیکھا ہے وہ ان کی باتوں کو بڑی عزت واحترام سے سنتا ہے یہ میرے لئے کافی تعجب کی بات تھی، یہ مُلّا طرح طرح کی کود پھاند اور رقص کرتے دکھائی دیتے ہیں اور اپنے پیروں کو مختلف طریقوں سے جنبش دیتے رہتے ہیں۔ اپنے بازوؤں کو حیرت انگیز طریقوں سے ہوا میں لہراتے ہیں اور اس طرح کی سینکڑوں غیر ضروری حرکات کرتے ہیں جو میرے خیال سے اتنی قابل عزت واحترام نہیں معلوم ہوتیں جس عزت کی نگاہ سے بادشاہ اس انوکھے منظر کو دیکھتا ہے، بعض دفعہ مُلّا ہاتھ پھیلائے ہوئے اس کے قریب پہنچتے ہیں ان کی مٹھیاں ایک دوسرے سے ملی رہتی ہیں بادشاہ اُٹھتا ہے اور مُلّاؤں کے مبارک ہاتھوں کو چھوتا ہے اور پھر اپنے ہاتھوں کو نہایت متانت اور عقیدت کے ساتھ اپنے چہرہ اور ڈاڑھی پر پھیرتا ہے جس کو دیکھ کر میرا دل بے اختیار ہنسنے کو چاہتا ہے۔

قلعہ دہلی کے شہزادے

اس وقت (1775ء) بادشاہ کے ستائیس بیٹے ہیں سب بقید حیات ہیں اور مہال کی مکھیوں کی طرح بکثرت ہیں اب بھی اس کی عمر اس قابل ہے کہ تیمور لنگ کے خانوادہ میں اضافہ کرے۔

شمار کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت قلعہ دہلی میں اَسّی (80) سے زیادہ نظر بند شہزادے ہیں سب شادی شدہ ہیں ان میں سے اکثر کے بچے ہیں۔

غیر دانشمندانہ اور غیر فطری پالیسی کے شکار یہ بدقسمت مظلوم قلعہ کے ایک حصہ میں نظر بند ہیں جو آخری دور میں اسی افسوس ناک مقصد کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ یہاں وہ قابل رحم زندگی گذارتے ہیں اور آخر کار بہت سے اپنی تہی دستی سے تنگ آ کر اور مصیبتیں جھیلتے جھیلتے مر جاتے ہیں۔ حاکمِ وقت کی جانب سے ان کا گذارہ الاؤنس مقرر ہوتا رہتا ہے، اس میں کمی بیشی ان کے ماؤں کے اعزاز واثر ورسوخ اور بادشاہ وقت سے خونی رشتہ کی قربت پر منحصر ہے۔

بیشتر کے پاس ایک کمرہ بطور خواب گاہ ایک باورچی خانہ اور دوسری ملحقہ چیزیں ہیں اور یہی ان کی محدود ومحصور رہائش گاہ ہوتی ہے۔ صرف عورتیں ان کی خدمت پر مامور ہوتی ہیں ___ وہ اتنے غریب ہوتے ہیں کہ خواجہ سرا نہیں رکھ سکتے۔ ملک کی تہذیب انہیں گھر کے کام کاج کے لئے دوسرے مرد خدمت گار رکھنے کی اجازت نہیں دیتی جس حصہ میں یہ رہتے ہیں اس کے دروازہ

پر سپاہیوں کی ایک کمپنی ناظر کی سرکردگی میں نگرانی کرتی رہتی ہے۔ ناظر بادشاہ کا معتمد خواجہ سرا ہوتا ہے اور وہی عام طور پر محل کا انتظام وانصرام کرتا ہے۔

بعض شہزادوں کو گذارہ کے لئے ایک روپیہ یومیہ ملتا ہے، بعض کو دو، بعض کو تین، اور بعض کو چار یا پانچ، بادشاہ کے تین بھائی ہیں جو ان ہی شہزادوں کی طرح قید و بند میں ہیں، لیکن وہ تین سو روپیہ ماہوار ان کی اور ان کے اہل وعیال کی گذراوقات کے لئے دیتا ہے، محمد شاہ کا ایک بھائی جو اب تک حیات ہے اٹھارہ ہزار روپیہ سالانہ پاتا ہے..... یہ بہت بڑی رقم ہے۔

شاہی خاندان کے تمام شہزادے جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے انتہائی ناخوشگوار زندگی گذارتے ہیں۔ گذراوقات کے لئے جو رقم مقرر ہوتی ہے وہ بھی باقاعدگی سے نہیں ملتی۔ ایسی صورت میں وہ اپنے قید خانہ میں بڑی واویلا کرتے ہیں اور چونکہ یہ قید خانہ بادشاہ کی رہائش گاہ سے زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے اس لئے ان کا ہر لفظ ان کے گوش گذار ہو جاتا ہے۔ جب میں دہلی پہنچا تو شہزادوں کو دو ماہ سے کچھ نہیں ملا تھا، ان کی اشیاء خورد ونوش فراہم کرنے والوں نے مزید فراہمی سے انکار کر دیا تھا۔ دو روز سے انہوں نے کچھ بھی نہیں کھایا پیا تھا۔1 وہ پے در پے اتنی زور زور سے آہ وزری کر رہے تھے کہ بادشاہ کو جس کے پاس بھی کچھ رقم نہیں تھی، قیمتی جواہرات دہلی کے ساہوکاروں کے پاس بھیجنا پڑے تاکہ محض قرضہ کی ادائیگی ہو جائے۔

شہزادوں کی حالت اس سے پیشتر اور بھی بدتر تھی یہ بدقسمت شہزادے اس سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ دارالسلطنت سے دور دراز کے قلعوں میں قید کر دیئے جاتے تھے، جہاں انہیں ہر صبح ایک عرق پینے کو دیا جاتا تھا جس کو پوست کہتے تھے۔2

بادشاہ کے فرزند

فرخندہ بخت کتب بینی کا شوقین ہے اس نے عربی اور فارسی کی کافی کتابیں جمع کی ہیں اور اپنا تمام وقت ان کی ورق گردانی میں صرف کرتا ہے۔

ان دو شہزادوں کی گذراوقات کے لئے جو رقم دی جاتی ہے وہ بہت کم ہے محض ضروریات زندگی پوری ہو جائیں اور بادشاہ اس سے زیادہ کچھ نہیں دیتا۔ بڑا بیٹا جواں بخت تقریباً 30 سال کا ہے اور اس سے چھوٹا (فرخندہ بخت) 27 یا 28 سال کا ہے، ان میں سے کوئی بھی شادی شدہ نہیں،

لیکن ان کے کنوارے پن کو خوش گوار بنانے کے لئے انہیں چند کنیزیں عطا کر دی گئی ہیں جن کی کفالت ان ہی کے ذمہ ہوتی ہے۔ تیسرے بیٹے سلطان3 اکبر کے ساتھ دو بڑے بیٹوں کے مقابلہ میں بہتر سلوک کیا جاتا ہے۔ اٹھارہ سال کے سن میں وہ اٹھارہ بیویوں کا شوہر ہے۔

دارالسلطنت دہلی کی حالت

دارالسلطنت (دہلی) کی حالت حکومت کے حال دگرگوں سے قطعی مطابقت رکھتی ہے۔ نگاہ اُٹھا کر جس طرف بھی دیکھئے بربادیوں کے ڈھیر اور تباہیوں کے نشان اندرون قلعہ تک پھیلے ہوئے نظر آئیں گے یہاں تک کہ بادشاہ کے کمروں کے دریچوں کے نیچے بھی یہی کیفیت نظر آئے گی، ہر جگہ دکھائی دینے والے یہ مناظر درحقیقت افلاس اور گذشتہ مصائب کے افسوس ناک مظاہر ہیں۔ شہر کے چاروں طرف تقریباً ایک فرسخ4 تک ملبہ کے ڈھیر پڑے ہوئے ہیں اس نظارہ میں اس سے زیادہ قابلِ افسوس اور کیا بات ہوسکتی ہے کہ اس وسیع دائرہ میں ایک عمارت تک دکھائی نہیں دیتی، اندرون شہر بھی حالت کچھ تسلی بخش نہیں، بڑے بڑے محلے فرش خاک ہو چکے ہیں اور اس کا ملبہ جابجا نظر آتا ہے اگر ہم اس ملبہ کو جمع کریں تو ایک طویل وعریض شہر عالم وجود میں آ سکتا ہے۔ مجھے یہ یقین ہے کہ شہر کا ایک تہائی حصہ بربادیوں کی نذر ہو چکا ہے۔

دہلی دربار ایک اُجڑا دیار

دربار میں قطعی کوئی شان وشوکت نہیں، اورنگ زیب کے دربار کے حاضرین کے اس پُرشکوہ منظر کے بجائے جس کی تصویر کشی برنیئر نے نہایت دلچسپی اور صحت کے ساتھ کی ہے۔ اب کفایت شعاری کی ایک ایسی تصویر ہے جس سے ظاہری طمطراق کے ذوق وشوق کی کمی کا اندازہ نہیں ہوتا بلکہ حقیقتاً افلاس ٹپکتا ہے۔ میں نے یہاں کے دربار عام کے جشن دیکھے ہیں، ان میں کسی قسم کا تزک واحتشام نہیں، بادشاہ درباری اور محل کا ساز وسامان سب ہی انتہائی مفلسی و ناداری کا پتہ دیتے ہیں مختصر یہ کہ ظاہری عزت وعظمت کے علاوہ کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی۔ جن سے ان تصورات کی تصدیق ہو سکے جو مغل اعظم کے دربار کی دولت وثروت کے سابقہ بیانات سے ذہن میں پیدا ہوئے ہیں۔

نقرئی عصا برداروں کے بجائے جو دربار عام کے جشن کے دوران نظم وضبط برقرار رکھتے تھے،تقریباً ایک سو میلے کچیلے چیتھڑوں میں ملبوس افراد نظر آتے ہیں جن کے ہاتھوں میں موٹے موٹے ڈنڈے ہوتے ہیں جن کو وہ بادشاہ کے آنکھوں کے سامنے ہی آزاد دائیں بائیں گھماتے رہتے ہیں، بادشاہ اس وقت سے پہلے کبھی منظر عام پر نہیں آتا جب تک ہزاروں ڈنڈے لوگوں پر نہ پڑ جائیں اور اس میں اس کی کوئی پروانہیں ہوتی کہ ان کے ڈنڈے کہاں اور کس پر پڑ رہے ہیں، مجھے یہ اعتراف ہے کہ دربار کا یہ طریقہ مجھے ہمیشہ غیر معمولی محسوس ہوا، کافی وزنی سونے اور بہت سے بیش قیمت جواہرات سے مرصع تخت کی جگہ اب ملمع کی ہوئی لکڑی کی ایک آرام کرسی پڑی ہوئی ہے، جس سے بار بار اس اونگھتے ہوئے شہزادہ کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے جو نادر شاہ کی دہلی آمد کے وقت اس پر متمکن تھا۔

تقریباً 60 خواجہ سرا اور چند تاتاری کنیزیں محل کے اندرونی حصہ کی نگرانی پر مامور ہیں۔ بادشاہ ان کے مقابلہ میں بے دست وپا ہے۔

صوبہء دہلی کی کیفیت

حالیہ مصائب وشدائد اور طوائف الملوکی کے دوران دہلی کا صوبہ عضو معطل کی صورت اختیار کئے رہا اور اس نے کوئی کردار ادا نہیں کیا، سکھ، جاٹ، راجپوت، یکے بعد دیگرے اس کی بوٹیاں نوچتے رہے، آخر کار انہوں نے بادشاہ کے عہدیداروں کو ملا کر اسے آپس میں بانٹ لیا اور کم سے کم حصہ جو ممکن ہوسکتا تھا اس کے لئے چھوڑا، اس انتشار و بدنظمی کے زمانہ میں ایک عجیب وغریب چیز نظر آئی وہ یہ کہ دہلی کے صوبہ میں بہت سے بڑے بڑے دیہات ایسے ہیں جن کی حالت بہتر ہے اور جن کا بہ آسانی تحفظ ہوسکتا ہے قرب وجوار کے کسان اپنی اپنی بستیاں چھوڑ کر ان بڑے دیہاتوں میں بس گئے ہیں اور انہوں نے مشترکہ طور پر ایک ایسی مجلس قائم کر لی ہے جو ان کے عام معاملات کا انتظام کرتی ہے، نہ وہ صوبہ کے غاصب حکمرانوں کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ حقیقی آقاؤں کو وہ جب مجبور کر دیئے جاتے ہیں تو اپنی فصلوں کو بچانے کی خاطر، کچھ روپیہ ادا کر دیتے ہیں اپنے دیہاتوں کی چہار دیواریوں میں دس بارہ ہزار بندوقچی رکھتے ہیں جو حملہ کے وقت ان کی حفاظت کرتے ہیں اور بقیہ ایام میں کھیتی باڑی میں مشغول رہتے ہیں، ان دیہاتوں کی

حیثیت چھوٹی چھوٹی عوامی جمہوریتوں جیسی ہے جو بہت سی باتوں میں ان شاہی شہروں سے مشابہ ہیں جو جرمنی میں واقع ہیں۔

سلطنت دہلی کے ہمسائے۔ جاٹ

عام طور پر جاٹ اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ اگر انہیں خود کو مسلح نہ رکھنا پڑتا تو وہ بخوشی کاشتکاری اور دستکاری میں منہمک رہتے اور حالات ناسازگار نہ ہوتے تو ان کے علاقے کی حالت بہتر ہوتی۔ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ.....تمام میدانی علاقہ میں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا قلعوں کا کھیت اُگا ہوا ہے، کیونکہ تمام گاؤں میں اس طرح کے انتظامات موجود ہیں۔ میں نے ان کے ایسے گاؤں دیکھے ہیں جن میں سے تین یا چار پر اکثر مخالف طاقتیں قابض ہوتی رہتی ہیں یہ طوائف الملو کی اور افراتفری کی ایک ایسی صورت ہے جس کی خوفناکیوں کی تصویر کھینچنا ایک دشوار کام ہے۔ میرے اندازہ کے مطابق جاٹوں کی جانفشانی کے سلسلہ میں ایک بات قابل داد ہے اور وہ یہ کہ ان تمام مشکلات کے باوجود میدان اتنے خالی نظر نہیں آتے جتنے تصور کئے جاسکتے ہیں اور کھیتوں کی دیکھ بھال بھی توقع سے زیادہ کی جاتی ہے۔ گاؤں آدمیوں سے پٹے پڑے ہیں ان کی کافی تعداد نظر آتی ہے ان کے کئی شہر بھی ہیں جن میں قابل ذکر (بھرت پور، ڈگ، کمبھر کے بعد) باری دھولپور، فیروز آباد، شکوہ آباد، فتح پور، بیانا، در، گواردھن، متھرا وغیرہ ہیں۔

ہندوستان کی فوجی تنظیم

اس سلسلہ بیان میں ہندوستان کی فوجی حالت کا ذکر کچھ بے محل نہ ہوگا یہ عظیم ملک جو آج طوائف الملو کی کا شکار ہے اور دراصل یہ اس کے نامساعد حالات کا نتیجہ ہے سپاہ سے بھرا ہوا ہے یہ سپاہ پیادوں اور سواروں میں تقسیم ہے۔ پیادہ فوج کی مزید کئی قسمیں ہیں ان میں سے صرف دو کا جو خاص حیثیت رکھتی ہیں، یعنی سپاہیوں اور برق اندازوں کا ذکر کروں گا، سپاہی دستی بندوقوں اور سنگینوں سے مسلح رہتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں یا تو یورپ سے درآمد کی گئی ہیں یا اسی ملک میں تیار کی جاتی ہیں۔ برق اندازوں کے پاس توڑے دار بندوقیں ہوتی ہیں جو دنیا کے اسی حصہ میں استعمال کی جاتی ہیں سوار مختلف اسلحہ سے لیس ہوتے ہیں اور اسلحہ کا انتخاب ہر سوار کی اپنی مرضی

سے ہوتا ہے بعض اپنی تلواروں کے ساتھ دستی بندوقیں اور سنگینیں بھی رکھتے ہیں، بعض نیزے اور بعض تیر وکمان، کچھ اپنے ہتھیاروں میں پستول رکھتے ہیں اور یہ سب بے تکے پن سے مسلح ہوتے ہیں بعض حکمرانوں نے جنہیں اپنے دستوں کی بہتر تنظیم پر فخر ہے ان انگریزوں کی ہر ممکنہ نقل ہے جو انہیں یورپ کی فوجی تنظیم سکھاتے ہیں۔ شجاع الدولہ نے اس سلسلہ میں بڑی کوششیں کی ہیں۔ اس کے پاس سپاہیوں کی 23 بٹالینیں ہیں جو اپنے اسلحہ، وردیوں، قواعد وضوابط کے لحاظ سے اس طرز پر منظّم ہیں جو انگریزوں نے بنگال میں اختیار کی ہے اس نے اپنے سوار دستوں کو ہمارے طریقہ پر منظّم کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی مگر اخراجات کی وجہ سے تشنہ تکمیل رہی ایک فرانسیسی نے جو ہماری ہندوستانی کمپنی کا سابق آفیسر تھا توپوں کو درست کرنے توپوں اور بارود کی گاڑیوں کے بنانے میں رہبری کر کے اس کے توپ خانہ کو باقاعدہ طور پر مرتب کیا، اس بنا پر شجاع الدولہ خود کو یہ کہہ کر خوش کر سکتا ہے کہ ہندوستان میں اس کے پاس بہترین توپ خانہ ہے ایک دوسرے فرانسیسی نے مختلف سائز کی توپیں تیار کر دیں جو بہتر ثابت ہوئیں۔

ہر فرماں روا کے پاس سپاہیوں کی تعداد اس کی اپنی خواہش کے مطابق ہوتی ہے، کوئی تعداد مقرر نہیں ہے، یورپ کی طرح سوار یا پیادہ فوج کے لئے تعزیری قوانین نہیں ہیں وہ جب چاہتے ہیں علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ ان فرماں رواؤں کے مقروض نہ ہوں یا ان کے پاس ان کا دیا ہوا سامان نہ ہو جن کے وہ ملازم ہیں۔

رسالہ کے سوار کو اپنا گھوڑا اور اسلحہ خود فراہم کرنا پڑتا ہے اور یہ وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ دنیا کی بدترین فوج فراہم ہوتی ہے۔ ان کی وردیوں، ہتھیاروں یا گھوڑوں میں کوئی یکسانیت نہیں ہوتی جس کی وجہ سے ان کا پیش کردہ منظر ایسا ناگوار محسوس ہوتا ہے کہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔

ان لوگوں میں ہمت کی کمی نہیں، لیکن یہ جنگی چالوں سے ناواقف ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ ترتیب وتنظیم کسے کہتے ہیں اور باقاعدہ طور پر صفیں قائم کر کے کس طرح لڑتے ہیں۔ صف یا قطار کا خیال کئے بغیر گھوڑے کو اس طرح سرپٹ دوڑاتے ہیں جس طرح ہمارے یہاں کے رئیس، اور جب دشمن کی فوجیں اور بندوقیں انہیں خبردار کرتی ہیں کہ وہ خطرے میں ہیں تو ہر ایک اپنی اور اپنے گھوڑے کی جان بچانے کی فکر کرتا ہے، بعض موقعوں پر دوران جنگ ایسا بھی ہوا کہ انہوں نے دشمن کے توپ خانہ پر یکا یک جا پڑنے کا فیصلہ کیا، بڑی دلیری سے بڑھے اور اس سے نکلنے والے

گولوں سے منہ نہ موڑا لیکن جب وہ اس کے قریب پہنچے جو اگرچہ خاموش ہو چکا تھا اور اگر وہ پیش قدمی جاری رکھتے تو اس پر قابض ہو جاتے، اسے دیکھتے ہی پیٹھ دکھا بیٹھے اور اس افراتفری میں بھاگے گویا کسی گولے نے ان کے پرخچے اُڑا دیئے ہیں، یہ سب کچھ ان کی بے قاعدگی، بے ترتیبی اور ابتدائی جنگی چالوں سے ان کی ناواقفیت کی بنا پر ہوتا ہے۔

ان فوجوں کی تشکیل میں ایک دوسرا نقص یہ ہے کہ ان میں وہ یکجہتی اور منظّم صورت نہیں پائی جاتی جو ہمارے یہاں ہوتی ہے فوج کے مختلف حصے ایک دوسرے سے قطعی بے تعلق ہوتے ہیں، ان حصوں پر کوئی افسر خصوصی یا عمومی طور پر متعین نہیں ہوتا اور نہ فوج کے دوسرے افسران سپریم کمانڈر کے تابع ہوتے ہیں یہ ماتحت افسران آپس میں بھی کوئی تعلق قائم نہیں رکھتے اور نہ ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ فوجی نشانات اور عہدوں کی درجہ وار ترتیب سے ناواقف ہیں، ہم ان کے رسد اور سامان جنگ کے ذخائر کے متعلق بھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ فوج کا ہر گروہ اپنا تمام سامان خود اپنی مرضی سے مہیا کرتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے پاس گولہ بارود کا معقول انتظام نہیں ہوتا اور یہ ناقص طریقہ اور بہت سی بُرائیوں کا موجب بن جاتا ہے چونکہ تمام سپاہیوں کو زندہ رہنا ضروری ہے اس لئے یہ فوجیں اپنے عقب میں بیشمار چھوٹے چھوٹے سوداگروں کو لے کر چلتی ہیں جن کے پاس غذائی سامان ہوتا ہے جو نفع کے تصور میں کھنچے چلے جاتے ہیں اگر ہم ان رسالوں کے سواروں کے ساتھ ان کی مستورات اور ملازمین کو شامل کر دیں تو ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ فوجیں کیسے خوفناک جمِ غفیر کی صورت اختیار کر لیتی ہوں گی قدیم مورّخین نے شاہانِ عجم کی جن کثیر التعداد فوجوں کا ذکر کیا ہے غالباً ان کی تعداد ان ہی فضول اور بیکار محض آدمیوں کی وجہ سے بڑھ جاتی ہو گی، جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ محمد شاہ، طہماسپ قلی خاں (نادر شاہ) کے مقابل 8 لاکھ سے زائد سپاہ لے کر گیا تھا اس کی فوج اسی طرح کے افراد پر مشتمل تھی۔

رسالے کھلے آسمانوں کے نیچے پڑاؤ ڈالتے ہیں۔ صرف چند مخصوص سرداروں کے پاس خیمے ہوتے ہیں۔ خیمے نصب کرنے کے طریقوں سے وہ ناقابل یقین حد تک ناواقف ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ مدافعانہ اور جارحانہ اقدامات کس طرح کئے جاتے ہیں۔ پیش قدمی اور جوابی پیش قدمی کے فن سے بھی آگاہ نہیں ان کے جنگ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ پہلے دشمن کی گھات

میں رہتے ہیں اور پہلی بار سامنا ہوتے ہی جنگ شروع کر دیتے ہیں ان کی سب سے زیادہ کوشش یہ ہے کہ وہ جس علاقہ پر حملہ آور ہوں وہاں کی ہر چیز کو تباہ و برباد کر دیں اور اس علاقہ کے باشندوں کو جنہیں فریقین کے تنازعہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تلوار کے گھاٹ اُتار دینے کو نہایت مفید جنگی کارروائی سمجھتے ہیں انہیں یہ یقین ہے کہ اس طرزِ عمل سے دشمن خوف زدہ اور صلح پر جلد آمادہ ہو جاتا ہے۔ جس طرح وہ فنون حرب سے واقف نہیں ہیں اسی طرح ان کا بین الاقوامی قانون بھی کچھ بہتر اصولوں پر مبنی نہیں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کوئی ہندوستانی فرماں روا باقاعدہ فوج ترتیب دینے کا عزم کرے اور مستقل طریقے سے اسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے تو اسے سب پر برتری حاصل ہوسکتی ہے لیکن یہ تعجب کی بات ہے کہ اب تک کسی فرماں روا کے دماغ میں یہ واضح بات سرسری طور پر بھی نہیں آئی بہرحال ایک وقت آئے گا جب وہ اس کی ضرورت محسوس کریں گے اور اس طرح ان کے جنگی طریقوں میں ایک انقلاب عظیم آئے گا جس کے ردِعمل کو اہل یورپ بھی محسوس کریں گے، ان میں انگریز دوسری قوموں کے مقابلہ میں بہت کچھ کھو بیٹھیں گے کیونکہ سب سے زیادہ انہوں نے ہی ہماری طرزِ جنگ کی برتری کا احساس دلایا ہے اور اس سلسلہ میں وہ آسانیاں مہیا کی ہیں جن کے ذریعہ وہ ان طریقوں پر باآسانی عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔

میں نے اکثر ہندوستان کے سپاہیوں کی مجموعی تعداد معلوم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ کچھ ایسا دشوار گذار مرحلہ ہے کہ صحیح اندازہ لگانا ناممکن ہی ہے.....شجاع الدولہ اور دوسرے واقف کاروں سے میری تفصیلی گفتگو ہوئی ہے اس سے مجھے یقین ہے کہ میرا یہ اندازہ غلط نہیں ہے کہ اس وسیع خطہ میں جو گنگا کے اس پار واقع ہے اور ہندوستان سمجھا جاتا ہے ایک لاکھ ساٹھ ہزار سے زیادہ پیادہ اور سوار فوج نہیں۔

اگر مغل بادشاہ اپنا اقتدار دوبارہ قائم کرلیں تو یہ عظیم الشان فوج جلد ہی مناسب تعداد اختیار کرلے گی اور اس وقت یہ خانہ جنگیاں جو منصب داروں میں آپس میں ہوتی رہتی ہیں بند ہو جائیں گی اور پھر کثیر التعداد فوجیں رکھنے کی کوئی معقول وجہ نہ ہوگی۔

چھوٹے چھوٹے راجہ جن کے امن و امان کو ان سے زیادہ طاقت ور منصب دار متواتر تباہ

کرتے رہتے ہیں اپنی تمام جدوجہد زیادہ سے زیادہ فوج جمع کرنے میں صرف کرتے ہیں اور چونکہ یہ رسالے ان کے لئے کافی گراں باری کا سبب ہوتے ہیں بنابریں وہ اس سے سبک دوش ہونے کے لئے اپنی سرحدوں پر واقع علاقوں پر حملہ کرتے ہیں اور نہایت بدسلوکی اور غیر منصفانہ طور سے زیادہ سے زیادہ جتنی رقم ممکن ہوسکتی ہے وصول کرتے ہیں۔

ہندوستانی انگریزی رسالوں کو دنیا کی بہترین سپاہ تصور کرتے ہیں..... تاہم ان مٹھی بھر انگریزوں نے جو حقیقی سپاہیانہ شان کے مقابلہ میں کمتر ہیں نصف سے زیادہ جزیرہ نما پر اپنی غلامی کا جوا رکھ دیا ہے۔

نواب نجف خاں کی افواج بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور وہاں ان لوگوں کے طریقہء جنگ کا صحیح اندازہ لگانے کا بھی موقع ملا ہے وہ ہمارے جنگی اصولوں سے اتنے بے بہرہ ہیں جتنا بدنظمی ___ نظم وضبط سے ناآشنا ہوتی ہے، مختلف دستے مختلف سرداروں سے وابستہ ہیں اور وہ جب چاہتے ہیں انہیں علیحدہ کر دیتے ہیں ہر ایک اپنے خیال کے مطابق جہاں چاہتا ہے خیمہ زن ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے تمام فوج بے ترتیبی سے چاروں طرف بکھر جاتی ہے پیادے، سوار اور توپ خانہ کوئی بھی اس قابل نہیں رہتا کہ دوسرے کی مدد اور اس کا تحفظ کر سکے وہ انتہائی بے قاعدگی سے گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ اپنے پڑاؤ کے مقابل کی جگہ کو دشمن سے نبرد آزما ہونے کے لئے مناسب سمجھتے ہیں۔ جب موقع ہوتا ہے یہ دستے وہاں صفیں آراستہ کر لیتے ہیں تمام دستے ایک قطار میں کھڑے ہو جاتے ہیں، توپ خانے، میمنہ، میسرہ پر اور قلب کے مقابل لگائے جاتے ہیں، سوار عقب میں رہتے ہیں اور تین چار بڑے بڑے گروہوں کی شکل میں اس طرح جمع ہو جاتے ہیں جس طرح رئیسوں کی ایک غیر منظم جماعت ___ اس تنظیم کے ساتھ وہ دشمن کے مقابلہ کا انتظار کرتے ہیں۔

ہندوستان میں یورپ کے قسمت آزما

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ہندوستان اہل یورپ کے سیلاب کی آماج گاہ معلوم ہوتا ہے جو واقعی نفرت وحقارت کے مستحق ہیں اور ان کے نام سے ہندوستانیوں کو خوف محسوس ہوتا ہے ان میں اکثریت ایسے بدسرشت افراد کی ہے جو ہر جرم وگناہ کے مرتکب ہو سکتے ہیں انتہا درجہ کے

بدمست شرابی ہیں جس سے یقیناً دوسرے خوف زدہ ہوتے ہیں۔ میں نے ایک جرمن مسٹر سومبر کو اس کی خیمہ گاہ میں دیکھا ہے۔ جہاں وہ نہایت اطمینان وسکون سے اپنے ایسے خونین اور غیر فطری واقعات پر فخر کرتا ہے جن کا تصور ممکن نہیں۔

شیطنت کا یہ پتلا اس ملک کی ایک عورت کے ساتھ سفر کر رہا تھا جس سے اس نے شادی کر لی تھی اور جس سے اس کے دو بچے بھی تھے۔ بچوں کی چیخ و پکار اور ان کی کفالت سے تنگ آ کر اس نے بذاتِ خود ان تینوں کو ایک کنوئیں میں دھکیل دیا اگر کوئی تفصیل سے لکھنے بیٹھ جائے تو ان بدمعاشوں کی بداعمالیوں اور سیاہ کاریوں کی داستان ختم نہیں ہو سکتی۔

ان تمام لفنگوں میں جن کو میں نے دیکھا ہے فرانسیسیوں سے زیادہ کسی کو قابلِ نفرت نہیں پایا۔ مے نوشی ان کی محبوب ترین برائی ہے اور بڑے بڑے جرائم جن کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا انگریزوں اور جرمنوں میں مقابلتاً زیادہ ہیں۔ فرانسیسی اگر ان کو اصلاً اس نام کا مستحق سمجھا جائے اس عرق (شراب) کی وجہ سے انتہائی ذلیل اور وحشی ہو گئے ہیں۔ ان میں سے اکثر غربت وافلاس میں پڑے ہیں جو اسی بری عادت اور اعصابی اضطراب کا نتیجہ ہے اور جو ان کی حالت کو بد سے بدتر بنا رہی ہے۔

ان تمام تباہ حال افراد کے اہل وعیال ہیں اور غیر محسوس طور پر ان سے ایک اور نسل بنتی جا رہی ہے یہ اپنی ناقص تعلیم کی وجہ سے اس ملک کی خرابیوں کو اپنا کر اپنے اسلاف کا نام ڈبو رہے ہیں یہ ایک ایسی چیز ہے جو اشرار کی تخلیق کے لئے زیادہ موزوں ہے مجھے یقین نہیں ہے کہ وہ اپنے اصل کو جھٹلا رہے ہیں۔

انتظامی اور سیاسی حالت

میرے لئے ہندوستان کی سیاسی حالت کے متعلق چند جملے لکھنا بھی ضروری ہیں، قانون اور لاقانونیت ایسی دو چیزیں ہیں جو اپنے بنیادی مفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن ایک ایسا معاشرہ بھی جیسا کہ یہ ہے کسی نہ کسی قانون کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا اور بلاشبہ یہاں ایک ایسا مروجہ قانون موجود ہے جس کی وجہ سے یہ حکومت جو منتشر و منقسم ہو چکی ہے بظاہر ہم آہنگی رکھتی ہے علاوہ ازیں ہمیں یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ لاقانونیت عام نہیں ہے

دراصل بادشاہ جو اپنے ماتحتوں کو تابع فرمان دیکھنا چاہتا ہے اور اس کے متوسلین کے درمیان ایسا ہے جو اس کے اقتدار سے آزاد ہو چکے ہیں لیکن مؤخرالذکر کے ان علاقوں میں جہاں وہ قابض ہیں فوجوں کی طاقت سے جن کے ذریعہ قوانین بالجبر منوائے جاتے ہیں لوگ اطاعت گزاری اور فرائض کی ادائیگی کے لئے مجبور ہیں۔

> پہلا اصول جس پر ان کا سیاسی قانون مبنی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی حکومتوں (یعنی علاقوں) میں کچھ اسی قسم کا وسیع اور مطلق اقتدار رکھتے ہیں جس طرح کا بادشاہ ان پر رکھنے کا بے وجہ دعویٰ کرتا ہے۔

ہمارے مشاہدہ کے مطابق اس سیاسی کلیہ نے انتظامی امور کو مختصر کر دیا ہے اور بنا بریں فرماں روا کی اپنی مرضی و خواہش ہی قانون ہے۔ تاہم حاکم بذات خود تمام امور انجام نہیں دے سکتا اس لئے اختیارات مختلف شعبوں کے افراد میں تقسیم کر دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

عدلیہ

اسی طرح عدلیہ کا نظام بھی اسی قدر سادہ اور سہل ہو کر رہ گیا ہے ___ ایسے ملک میں مقدمات شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں جہاں سچ پوچھئے تو کوئی حق ملکیت (یعنی ذاتی ملکیت) نہیں ہے۔

ہم بڑے بڑے شہروں میں ایک یا دو جج دیکھتے ہیں جو مقدمات کو سرسری طور پر بغیر تحقیقات کے فیصل کر دیتے ہیں۔ ہر شخص اپنے مقدمہ کی خود پیروی کرتا ہے اپنی بریت کے لئے شہادتیں اور دوسرے ذرائع خود ہی تلاش کرتا ہے۔ بیشتر اختلافات اس قدر سہل ہوتے ہیں کہ اگر مساوات اور غیر جانبداری کو ملحوظ رکھا جائے اور جس کا لحاظ جج کو ہونا چاہئے، تو فیصلہ میں کسی غلطی کا امکان نہیں ہوسکتا، مگر وہ انتہائی بے حیائی کے ساتھ اپنے فیصلوں کو فروخت کر دیتے ہیں، بعض اوقات وہ سزا کے خود بھی مستوجب قرار دیدیئے جاتے ہیں۔ لیکن اس وقت جب فرماں روا کے پاس بہت سی شکایات پہنچ چکی ہوں اور وہ اس طرف غور کرنے پر مجبور ہو گیا ہو۔

شہروں میں پولیس کا نظام سخت ہے، لوگ بڑے امن و امان سے رہتے ہیں اگر تاجر اور دستکاران پریشانیوں کا شکار نہ ہوتے جو ان کی دولت وثروت کی شہرت کی بنا پر اکثر و بیشتر لاحق ہوتی رہتی ہیں تو وہ فارغ البال اور خوش حال نظر آتے ظالم حکمراں کسی بات کا خیال نہیں کرتے۔ انہیں اپنی ضرورت کے وقت خواہ وہ حقیقی ہو یا بناوٹی دولت مند لوگ دشمن نظر آتے ہیں ڈرا دھمکا کر جتنا بھی ممکن ہوتا ہے وصول کر لیتے ہیں اس سلسلہ میں ان کے ساتھ انتہائی بدسلوکی کی جاتی ہے۔ گویا وہ اس کے قانوناً مستحق ہیں۔

محاصل

انتظامیہ کے اور شعبوں کی طرح محصولات کا نظام بھی نامکمل اور ناقص ہے۔ صوبے سرکاروں میں تقسیم ہیں جو عموماً بڑے بڑے علاقے ہوتے ہیں یہ سرکار پرگنوں میں منقسم ہیں جن کی وسعت ان سے کم ہے اس طرح سرکار اور پرگنے بڑی حد تک ہمارے جزیلٹیز اور الیکشن سے مشابہ ہوتے ہیں صوبہ کا والی مرضی کے مطابق کسی شخص کو سرکار پٹے پر دے دیتا ہے۔ یہ شخص سرکار کے صدر مقام پہنچتا ہے اور وہاں کے علاقے کے متعلق جملہ معلومات حاصل کر کے پرگنوں کو دوسرے پٹہ داروں کو دے دیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے ماتحتوں کے حوالہ کر دیتا ہے، غرضیکہ صوبیدار سرکار کے پٹہ دار، پرگنوں کے پٹہ دار اور ان کے ماتحت دوسرے افراد، سب اپنے مفادات حاصل کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ جن کی ذات سے ظلم وتعدی کے علاوہ کسانوں کو کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔

گاؤں میں ظلم و جور اور محصولات کی زیادتی عام طور پر نظر آتی ہے۔ محصلین، کسانوں سے ان کی غربت و ناداری کا پاس و لحاظ کئے بغیر ہر ممکنہ شے بالجبر وصول کر لیتے ہیں۔ اسی طرح صوبیدار، ان محصلین سے جو عام لوگوں کا مال ہضم کر لیتے ہیں، سختی سے رقم وصول کرتے ہیں اس قسم کی اطلاعات روزانہ موصول ہوتی ہیں۔

لوگ محصولات خوشی سے ادا نہیں کرتے۔ محصلین کی مدد کے لئے فوجیں روانہ کرنا پڑتی ہیں بعض اوقات محصلین کو بھی قید میں ڈال دیا جاتا ہے تاکہ ان کی جیب سے محاصل کی جمع شدہ رقوم نکالی جائیں۔

حوالہ جات

1- شہزادوں کی یہ حالت 1775ء میں تھی۔شاہ عالم کی آخری دور کی کفایت شعاری بلکہ بخل سے انہیں شدید تکالیف اٹھانا پڑیں، لارڈ لیک کے دہلی پر قبضہ کے فوراً بعد لیفٹیننٹ جون پیٹیر 18- ستمبر 1803ء کو قلعہ دیکھنے گیا،لکھتا ہے کہ ''محل سے ہم لوگ محافظ فوج کے اس حصہ میں گئے جو شہزادوں کے لئے مقرر تھا۔ہم نے انہیں دیکھا اور محسوس کیا کہ واقعی وہ اپنی ضروریات زندگی کے لئے بھی مجبور و بے بس ہیں، معمولی لباس پہنے ہوئے تھے اور بڑی تعجب کی بات یہ تھی کہ انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی اپنی مشکلات و تکالیف جو انہیں اس قید میں برداشت کرنا پڑی تھیں بتانا شروع کر دیں ان میں سے کوئی بھی اس محدود جگہ سے کہیں اور نہیں جا سکتا تھا جو ان کے لئے مقرر کر دی گئی تھی نگراں مقرر تھے تا کہ وہ ایسا نہ کر سکیں انہوں نے ہم سے التجا کی کہ ہم ان کی شکایتیں کمانڈر انچیف تک پہنچا دیں.....ہم نے ان کے وہ کمرے بھی دیکھے جن میں وہ اپنی بیویوں کو رکھتے تھے ہمیں بتایا گیا کہ ان میں سے بہت سی واقعی حسین و جمیل ہیں، ان میں سے اکثر کے بچے میں نے دیکھے ان کو دیکھنے سے یہ یقین ہوتا تھا کہ وہ واقعی ایسی ہی حسین ہوں گی میں نے ان سے زیادہ خوبصورت بچے اپنی زندگی میں نہیں دیکھے۔'' ''وار اینڈ اسپورٹ ان انڈیا۔''

2- اس کی تفصیلات کے لئے برنیئر کا سفر نامہ ملاحظہ کیجئے۔

3- وہ اپنے باپ کا چہیتا بیٹا تھا،25-اپریل 1760ء کو اس وقت پیدا ہوا جب شاہ عالم نے یہ سنا کہ اس کے باپ عالمگیر ثانی کو 29- نومبر 1759ء کو دہلی میں قتل کر دیا گیا ہے، گویا تاج شاہی پہننے کے بعد یہ پہلا لڑکا تھا۔

4- تقریباً 3 میل۔

☆.....☆.....☆